میں لبرل کیوں نہیں ہوں؟

میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں لبرل کیوں نہیں ہوں؟ بہت سے لوگ سوشل میڈیا پر مجھے یا میرا ایچ لال (LAAL) فالو کرتے ہیں۔ جب میں مختلف ایشوز پر پوسٹ کرتا ہوں تو بعض فالورز مجھے دیسی لبرل کہ کر تبصرہ کرتے ہیں۔ وہ کون سے ایشوز ہوتے ہیں؟ یہ ایشو وہ ہوتے ہیں جن میں یا تو اقلیتوں کی بات کرتا ہوں، یا مذہبی جماعتوں پر تنقید کرتا ہوں، یا حکومت وقت پر تنقید کرتا ہوں، یا خواتین کے حقوق کی برابری کی بات کرتا ہوں، یا پھر میں کہتا ہوں کہ دین اور سیاست کو جدا ہونا چاہئے یعنی کہ سیکولر ریاست ہونا چاہئے۔ جب میں اس قسم کی باتیں کرتا ہوں تو لوگ فوراً مجھے لبرل کہنا شروع ہو جاتے ہیں یا دیسی لبرل کا لقب دیتے ہیں۔ مگر مندرجہ بالا باتیں وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو لبرل نہیں ہوتے۔ مثلاً پورے پاکستان بلکہ دنیا بھر کے اندر جو سوشلسٹ سوچ کے لوگ ہیں وہ کہتے ہیں کہ کثیر المذاہب ممالک میں اقلیت اور اکثریت سے قطع نظر تمام مذاہب کے لوگوں کو امن و امان سے رہنا چاہیے اور تمام مذاہب کے افراد کے حقوق برابر ہونے چاہئیں۔

یہ باتیں صرف لبرلز نہیں کہتے سوشلسٹ بھی یہی کہتے ہیں۔ اسی طرح سوشلسٹ یہ کہتے ہیں کہ ریاست کو سیکولر ہونا چاہیے۔ سیکولرزم سے مراد یہ نہیں کہ آپ اپنا دین چھوڑ دیں۔ سیکولرزم سے مراد یہ ہے کہ مذہب کا ریاستی امور کے ساتھ تعلق نہیں ہوگا۔ ریاست تمام مذاہب کے درمیان غیر جانبدار کردار کی حامل ہوگی۔ سوشلسٹ یہ بھی کہتے ہیں کہ خواتین کے حقوق مردوں کے برابر ہونے چاہئیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خواتین اور مردوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فرق تو بالکل ہے لیکن اس فرق کی بنیاد پر خواتین کے ساتھ کسی قسم کا امتیازی سلوک نہیں ہونا چاہیے۔ یہ نا قابل قبول ہے۔ سارے سوشلسٹ کے کہتے ہیں کہ تاریخی طور پر خواتین کے ساتھ بہت سی ناانصافیاں ہوئیں۔ ان کو کم تر درجے کا شہری سمجھا گیا۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر آپ ان کے حقوق کی بات کرتے ہیں تو آپ لبرل ہیں۔ کیوں کہ سوشلسٹ بھی کسی قدر مختلف انداز میں ہی سہی خواتین کے حقوق کی بات کرتے ہیں۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جو سوشلسٹوں اور لبرلز کے درمیان مشترک نظر آتی ہیں۔ چاہے سیکولرزم کی بات ہو، جمہوری حقوق کی بات ہو، بنیادی شہری حقوق کی بات ہو، سوشلسٹوں اور لبرلز کے درمیان یہ مشترکات ہیں۔ مگر جس وجہ سے میں اپنے آپ کو لبرل نہیں کہتا وہ یہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ لبرل ازم بنیادی طور پر سرمایہ داروں کا فلسفہ ہے، سرمایہ داری نظام کو قائم رکھنے کا فلسفہ ہے اور سرمایہ داری نظام کے مکمل اظہار کا فلسفہ ہے۔ وہ کیسے؟ آیئے اس بات کا جائزہ لیتے ہیں۔

وہ ایسے کہ جہاں ہم سوشلسٹ بات کرتے ہیں کے انسان کی انفرادی آزادیوں کو قائم رکھنا چاہیے، لبرلز بھی انفرادی آزادی کی بات کرتے ہیں۔ اظہار رائے کی آزادی، اجتماع کی آزادی، تنظیم سازی کی آزادی وغیرہ سب لبرل ازم کے دائرے کے اندر آتا ہے۔ لبرلز انفرادی آزادیوں میں یہ آزادی بھی شامل کرتے ہیں کہ فرد کے پاس نجی اور ذاتی ملکیت کا حق ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب ہے کہ فرد کے پاس ایک بڑی سی فیکٹری یا زمین ہو جہاں وہ لوگوں کو ملازم بھی رکھے اور سرمایہ دار بنے۔ لبرل فلسفہ یہ سمجھتا ہے اگر فرد سے ذرائع پیداوار کی

ملکیت یا نجی ملکیت کا حق لے لیا جائے تو وہ اسے فرد کی آزادی کے خلاف تصور کرتے ہیں۔ ہم سوشلسٹ اس کے بالکل الٹ سمجھتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ فرد کی آزادی اس معاشرے میں ممکن ہی نہیں ہے جہاں 90 فیصد آبادی کو تمام ذرائع پیداوار یا معاشی وسائل سے محروم کر دیا جائے اور 10 فیصد آبادی تمام ذرائع پیداوار اور معاشی وسائل پر قابض ہو۔ جس کے نتیجے میں 90 فیصد آبادی 10 فیصد افراد کے لئے کام کرنے پر مجبور ہو۔ اور ایسے حالات میں کام کرنے پر مجبور ہو جس کے نتیجے میں 10 فیصد آبادی امیر سے امیر تر ہوتی چلی جائے جبکہ 90 فیصد غریب رہیں یا کم سے کم ان کی زندگی میں کوئی خاطر خواہ بہتری نہ آئے۔

چونکہ لبرلزم انفرادی آزادی کی بنیادی شرط یہ رکھتا ہے کہ فرد کے پاس سرمایہ داری اور سرمایہ کاری کا اور نجی جائداد رکھنے کا حق ہونا چاہیئے اور اس حق کو جس طرح سے بہتر سمجھتا ہو استعمال کرے۔ اسی وجہ سے میں نہ صرف خود کو لبرل نہیں کہتا بلکہ میں لبرلزم کا مخالف ہوں۔ اگر چہ میرے بہت سے دوست لبرل ہیں۔ لیکن یہاں اس نکتے کو سامنے لانا اور اسے بے نقاب کرنا بہت ضروری ہے۔ اگر چہ لبرل ایک سطح پر تو بات سارے سماج کی کرتے ہیں کہ ہر بندہ برابر ہونا چاہیے، ہر شہری کو اظہار رائے کی آزادی ہونی چاہیئے، اس کے برابر شہری حقوق ہونے چاہئیں، برابر سماجی حقوق ہونے چاہئیں مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب آپ معاشی اعتبار سے چند لوگوں کو وسائل پر قابض ہونے کا حق دیتے ہیں اور باقی پورا معاشرہ ان کے لیے کام کرنے پر مجبور ہو تو درحقیقت یہ معاشرہ ان کا غلام بن جاتا ہے۔ وسائل پر قابض طبقے کے پاس تو یہ تمام لبرل آزادیاں ہوتی ہیں جبکہ 90 فیصد عوام کے پاس یہ لبرل آزادیاں نہیں ہوتیں اور نہ ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ وہ بنیادی وسائل سے ہی محروم ہوتے ہیں۔

اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ لبرل ازم جو وعدہ کرتا ہے کہ تمام انسان برابر کے شہری ہوں گے وہ سرمایہ داری نظام کے اندر پورا ہو ہی نہیں سکتا۔ لبرل ازم کی سب سے بڑی منافقت یہی ہے وہ اس چیز کو پہچان نہیں پاتا، لبرلز اس چیز کو سمجھ نہیں پاتے کہ جو بڑے بڑے اور خوبصورت اصول جن کی وہ وضاحت کرتے ہیں وہ اصول کبھی بھی سرمایہ دارانہ نظام کے اندر رہتے ہوئے پورے نہیں ہو سکتے۔ وہ عزائم، وہ منزل اور وہ حتمی برابری جس کی وہ ہر طرف بات کرتے ہیں وہ سرمایہ دارانہ سماج کے اندر اور ایک طبقاتی معاشرے کے اندر جہاں امیر غریب کا استحصال کرتا ہے ایسے سماج کے اندر وہ منزل حاصل نہیں کی جا سکتی اور نہ وہ عزائم پورے نہیں کیے جا سکتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ لوگ اس منافقت کو سمجھ جاتے ہیں۔ مگر شاید وہ ان الفاظ میں بیان نہیں کرتے جیسے میں بیان کر رہا ہوں لیکن وہ سمجھ جاتے ہیں کہ لبرلزم مخصوص طبقے کا فلسفہ ہے، انگلش بولنے والوں کا فلسفہ ہے، دولت مندوں کا فلسفہ ہے۔ جس کی وجہ سے وہ خود کو اس فلسفے سے اجنبی اور غیر تصور کرتے ہیں اور اس کو پوری طرح سے اختیار نہیں کرتے۔

دکھ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ بہت سے ایسے خیالات جن کو لبرل افراد سامنے لے کر آئے ہیں وہ کوئی اتنے غلط بھی نہیں ہیں بلکہ اچھے ہیں۔ لیکن یہ اچھے خیالات بھی اسی بنیاد پر مسترد ہو جاتے ہیں کہ یہ طبقہ اشرفیہ کی جانب منسوب ہو جاتے ہیں اور لوگ کہتے ہیں کہ ہم ان کے تمام خیالات مسترد کرتے ہیں۔ اگر چہ یہ بھی کوئی مثبت صورت حال نہیں ہے۔ لبرلز چاہتے ہیں کہ ایک ایسا سماج ہونا چاہیے کہ جس کے اندر ہر شہری کو برابر کے سیاسی حقوق حاصل ہوں لیکن ہم کہتے ہیں کہ شہریوں کے معاشی حقوق بھی برابر ہوں۔ جب تمام شہریوں کے

معاشی حقوق برابر ہو جائیں گے گا تب لوگوں کے سماجی اور سیاسی حقوق بھی حقیقی معنوں میں برابری کی سطح پر آئیں گے۔لبرل ازم کے مقاصد کو سوشلسٹ نقطہ نظر اپنائے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔جب ہم لبرل عزائم یعنی تمام عوام کے لئے سیاسی اور قانونی برابری کی بات کرتے ہیں۔وہاں پر جب تک ہم معاشی مواقع کی برابری کی بات نہیں کریں گے، جو کہ بنیادی طور پر سرمایہ داری نظام کی مخالفت کی بات ہے،اس وقت تک مذکورہ بالا لبرل عزائم بھی پورے نہیں ہو سکتے۔

لبرلزم کیا ہے؟

اگر آپ کسی عام پاکستانی سے یہ سوال پوچھیں کہ لبرل کیا ہوتا ہے؟ تو اکثر جواب دیں گے کہ جناب لبرل وہ ہوتا ہے جو مادر پدر آزاد ہو۔ یعنی ہمارے سماج میں سمجھا یہ جاتا ہے کہ لبرل وہ آدمی ہے جو شراب پیتا ہے اور جو سماج میں فحاشی پھیلاتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جن لوگوں نے پاکستان میں لبرل ازم کا تعارف کروایا وہ نہ تو لبرلزم کو جانتے ہیں کہ یہ کیا ہے اور نہ انھوں نے کبھی پولیٹیکل سائنس پڑھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ جو خود کو لبرل ازم سے نتھی کرتے ہیں اکثر وہ پاکستان کے طبقہ اشرافیہ سے ہوتے ہیں اور ان کا لائف سٹائل انتہائی مغرب زدہ ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے لوگ سمجھتے ہیں کہ مغربی لائف سٹائل کا مطلب ہی لبرلزم ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کا لائف سٹائل تو مغربی ہوں لیکن وہ آمریت کی حمایت کرے کیا اس کو ہم لبرل کہہ سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں کیونکہ لبرل ازم کا تو مطلب ہی یہی ہے کہ وہ جمہوریت پسند ہوں۔ اس لیے اکثر لوگ اس ابہام کا شکار ہیں اور سمجھتے ہیں کہ لبرل وہ شخص ہے جو مغرب زدہ ہو اور مادر پدر آزاد ہو۔ لیکن دراصل لبرل ازم کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے۔

لبرل کا لفظ لبرٹی سے نکلا ہے۔ لبرٹی کا مطلب ہے آزاد ہونا، آزادی حاصل کرنا۔ لیکن میں آپ کو یہ بتا دو کہ میں لبرل نہیں ہوں کیوں نہیں ہوں؟ یہ بھی میں آپ کو بتا دوں گا۔ کم از کم میں یہ چاہتا ہوں کہ ہمیں سمجھ تو آئے کہ لبرل ازم ہوتا کیا ہے؟ مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے جب لوگ سیکولرزم، لبرلزم اور سوشلزم ہر چیز کو کنفیوز کر دیتے ہیں۔ کم از کم ہمیں اصطلاحات کا دوست مطلب اور اس کا درست استعمال تو معلوم ہونا چاہئے۔ لبرل ازم کا لفظ لبرٹی سے نکلتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ آزادی ہونی چاہئے۔ کس کو آزادی ہونی چاہئے؟ کیا بحیثیت مجموعی سماج کو آزادی ہونی چاہئے؟ نہیں، لبرلز یہ کہتے ہیں کہ ایسا سماج بنایا جائے جس کے اندر فرد کے پاس زیادہ سے زیادہ اختیارات ہوں۔ زیادہ سے زیادہ فیصلے انفرادی طور پر فرد خود کرے نہ کہ ریاست یا اس کے نام پر کوئی گروپ کرے۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ لبرلز شخصی آزادی یا انسانی حقوق یا انفرادی حقوق کی بات کرتے ہیں۔ کسی بھی معاشرے میں فرد بہت سے فیصلے کرتا ہے کہ حکومت کون کرے گا؟ شادی کیسے کرنی ہے؟ کپڑے کون سے پہننے چاہئیں؟ کیریر کونسا چننا ہے؟ شادی کس سے کرنی چاہئے یا نہیں کرنی چاہئے؟ بچے کتنے پیدا کرنے چاہئیں؟ معاشی نظام کون سا اپنانا چاہئے؟ معاشی پالیسیاں کونسی اپنانا چاہئیں؟ خارجہ پالیسی کیا ہونا چاہئے؟ اتنے بہت سے سوال ہیں جن کے جوابات کے لئے سماج کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

لبرل ازم یہ کہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ سوالوں کے جواب فرد کے اختیار میں چھوڑ دیے جائیں۔ اس میں معاشرہ اور ریاست مداخلت نہ کرے۔ یعنی کہ ریاست کا ڈھانچہ ایسا ہو جو کم سے کم سوالات کا جواب دینے کی کوشش کرے۔ کم سے کم چیزوں کو اپنے دائرہ اثر میں لے اور زیادہ سے زیادہ سوالات شہریوں کو منتقل کر دیے جائیں کہ وہ ان کا جواب دیں۔ مطلب یہ کہ انفرادی آزادی کو زیادہ سے زیادہ بڑھاوا دیا جائے۔ لبرلز کا یہی مقصد ہے اور یہی ان کی منزل ہے۔ لبرلز کہتے ہیں کہ اس چیز کو ممکن بنانے کے لیے کچھ بنیادی اصول اپنانے چاہئیں۔ مثلاً وہ یہ کہتے ہیں کہ حکومت اکثریت کی رائے سے قائم ہونی چاہئے عوام اپنے نمائندے خود منتخب کرے۔ دوسرا یہ کہ قانون کی نظر

میں سب برابر ہوں۔تیسرا یہ کہ ہر بندے کو ووٹ دینے کا حق ہو اور جمہوریت ہو۔چوتھا یہ کہ انسانی حقوق تحفظ اور انفرادی آزادیاں ہونی چاہئیں۔

ہر لبرل سیکولر ہوتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر سیکولر لبرل ہوں۔مثلاً ایک سوشلسٹ فرد بھی سیکولر ہوتا ہے لیکن وہ لبرل نہیں ہوتا۔وہ کہیں بھی سیاسی طور پر خود کو لبرل نہیں کہتے بلکہ کہتے ہیں کہ ہم لبرل ازم کے خلاف ہیں۔بہر حال سوشلسٹ بھی سیکولر ہیں اور لبرل بھی سیکولر ہوتے ہیں یہ ان کے درمیان مشترک بات ہے۔لبرل کہتے ہیں کہ ہم صنفی مساوات پر یقین رکھتے ہیں اور نسل پرستی کے بھی ہم خلاف ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ ہم بین الاقوامیت پر یقین رکھتے ہیں۔جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے نزدیک تمام انسانیت برابر ہے۔وہ کہتے ہیں تمام انسان برابر ہوں اور ایسے قوانین بنائے جائیں جو آفاقی ہوں۔جیسے یونیورسل ڈیکلئیریشن آف ہیومن رائٹس ہے۔یہ لبرل تصور سے ہی نکلا ہے۔اس سے مراد یہ ہے کہ کسی قوم کے لئے مخصوص قوانین نہیں بنانے بلکہ تمام انسانیت کے لیے آفاقی قوانین بنانا ضروری ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ کہتے ہیں کہ اظہارِ رائے کی آزادی ہونی چاہئے۔یہاں پھر وہی تصور ہے کہ ہر چیز فرد پر چھوڑی جا رہی ہے۔آپ مذہب کو مانتے ہیں یا نہیں مانتے آپ کی مرضی، آپ کون سا لباس پہنتے ہیں آپ کی مرضی، آپ ووٹ دیتے ہیں یا نہیں دیتے آپ کی مرضی، سیاست میں دلچسپی لیتے ہیں یا نہیں لیتے آپ کی مرضی، آپ پڑھتے ہیں یا نہیں پڑھتے آپ کی مرضی، آپ کو علم سے لگاؤ ہے یا نہیں ہے آپ کی مرضی، زیادہ سے زیادہ چیزیں فرد کی مرضی پر چھوڑی جاتی ہیں اور سماج اور ریاست کی کم سے کم مداخلت حمائت کی جاتی ہے۔اسی طرح ایسوسی ایشن کا حق بھی لبرلز کے لیے بہت اہم اصول ہے۔یعنی ہر فرد کو تنظیم سازی، سیاسی پارٹی یا کوئی پروفیشنل تنظیم بنانے کا حق ہونا چاہئے۔یہ حق نہیں چھینا جا سکتا یہ بھی فرد کی آزادی کا ایک حصہ ہے۔

لبرلز کہتے ہیں کی پریس کی آزادی ہونی چاہئے اس پر پابندی نہیں ہونی چاہئے۔خواہ وہ قومی مفاد کے خلاف لکھیں۔یاد رہے کہ قومی مفادات اور فرد کی آزادی میں تضاد ہے۔عوامی مفاد والے کہتے ہیں کہ ہم فرد کی نہیں قوم کی آزادی اور مفاد کی بات کرتے ہیں۔لبرلز کہتے ہیں فرد کی آزادی قومی مفاد پر مقدم ہے۔یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ لبرلز کہتے ہیں کہ قوم کے مفاد وہی ہیں جو فرد کے مفادات کا تحفظ کریں۔اس کے علاوہ حکومت اور ریاست کا کوئی مقصد نہیں ہے۔وہ یہ کہتے ہیں کہ مذہبی آزادی ہونی چاہئے جس کا دل چاہے وہ اپنی مرضی کا مذہب اختیار کرے اگر کسی کا مذہب پر عمل کرنے کا دل نہ چاہے تو وہ اس پر عمل نہ کرے۔مذہب کا معاملہ بھی مکمل طور پر فرد پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور لبرلز حلقوں کے اندر یہ بہت برا سمجھا جاتا ہے کہ کوئی کسی کو مجبور کرے کہ نماز پڑھو، زکوۃ دو یا روزہ رکھو۔یہ فرد کی صوابدید ہے کہ وہ اپنے لئے کیا بہتر سمجھتا ہے۔لبرلز یہ بھی کہتے ہیں کہ عدالتی نظام پر ریاست کا اثر نہیں ہونا چاہئے بلکہ عدلیہ مکمل طور پر آزاد ہونی چاہئے۔عدلیہ اور ججز کو ریاست کے دباؤ میں نہیں آنا چاہئے بلکہ ان کو ریاست کے دباؤ سے الگ ہو کر خود مختار طریقے اپنے فیصلے کرنے چاہئیں۔ مقدمات سرعام سنے جانے چاہئیں کیونکہ بند کمرے کے اندر تو کسی کو بھی سزائے موت سنائی جا سکتی ہے۔عوام کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ مجرم کو سزا کیوں ہوئی۔اس کے خلاف کیا شہادت پیش ہوئی۔لبرلز اس بات کے بہت حامی ہیں کہ پبلک ٹرائل ہونا چاہئے۔لبرلز یہ بھی کہتے ہیں کہ تعلیم سب کے لئے ہونی چاہئے۔ہر بندے کے پاس بنیادی تعلیم ہو۔وہ اسے بنیادی حقوق کے اندر شامل کرتے ہیں۔

معاشی نظام اور معاشی پالیسیوں کے حوالے سے لبرلز اور سوشلسٹوں کا بہت بڑا اختلاف ہے کیونکہ لبرلز سب سے پہلے لوگ تھے جنہوں نے کہا تھا کہ آزاد منڈی قائم ہونی چاہئے۔ سرمایہ دارانہ فری مارکیٹ اکانومی ہونی چاہئے۔ آزاد تجارت ہونی چاہئے۔ لہذا پرانے زمانے کی جو تجارتی پالیسی اور حفاظتی پالیسیاں تھیں جن میں ڈیوٹیاں لگائی جاتی تھی اور کہا جاتا تھا کہ بین الاقوامی تجارت فری نہیں ہوگی اور مقامی معیشت کے تحفظ کے نام پر یہ پالیسیاں اختیار کی جاتی تھیں۔ یورپ خاص طور پر انگلینڈ کے لبرلز نے سب سے پہلے ان پالیسیوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ انہوں نے کہا کہ تجارت کو کھول دو، آزاد تجارت ہونی چاہئے۔ آزاد تجارت ہوگئی تو معیشت بہت تیزی سے آگے بڑھے گی، اسی وجہ سے وہ بادشاہوں کی اجارہ داری کے خلاف تھے۔

وہ ہمیشہ تجارت پر پابندیوں کے خلاف رہے۔ انھوں نے کھلی تجارت اور سرمایہ دارانہ نظام کی حمایت کی۔ لبرلز کہتے ہیں کہ ریاست کی معیشت میں مداخلت کم سے کم کرنی چاہئے بلکہ کرنی ہی نہیں چاہئے۔ اگر کہیں مجبوراً کرنی بھی پڑے تو کرلیں وہ بھی صرف اس حد تک کہ قواعد وضوابط بنادیں اور کہیں کہ ان کے خلاف ورزی نہیں ہوگی۔ اگر کوئی خلاف ورزی کرے گا تو اس کے خلاف کارروائی ہوگی۔ اس کے علاوہ معیشت میں ریاست کا کوئی کردار نہیں ہونا چاہئے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہر تحریک کا کوئی نہ کوئی رنگ ہوتا ہے۔ جس طرح سوشلسٹ تحریک کا رنگ لال ہے اسی طرح فیمنسٹ تحریک کا بھی پرپل (Purple) رنگ ہے۔ امن کا رنگ سفید ہے پاکستان میں لبرل اگرچہ کوئی رنگ استعمال نہیں کرتے لیکن تاریخی طور پر لبرلزم کا رنگ پیلا تھا۔ لبرلز یہ بھی کہتے ہیں کہ سائنس کی ترقی اور سائنس کے پھیلاؤ کے حق میں ہیں۔ لبرلز کے بنیادی فلسفے کی بنیاد استدلال (Rationalism) پر ہے۔ اس سے مراد ہے منطق اور دلیل کو اہمیت حاصل ہو نہ کہ تصورات (Rvealation) کو۔ زندگی، سیاست اور دیگر فیصلوں میں منطق کا استعمال ہو۔

لبرل ازم کب شروع ہوا؟ یہ روشن خیالی (Age of Enlightenment) کے دور میں شروع ہوا۔ یعنی کہ یہ زیادہ قدیم نہیں موجودہ دور کا فلسفہ ہے۔ اس کا آغاز دو تین سو سال پہلے شروع ہوا زیادہ سے زیادہ پانچ سو سال کہے جاسکتے ہیں۔ یہ اس سے زیادہ پرانا نہیں ہے۔ اس زمانے میں اہم مسئلہ یہ تھا کہ تاجر طبقہ جو بعد میں سرمایہ دار طبقہ بنا، وہ چاہتے تھے کہ بادشاہت پیچھے ہٹے اور انہیں اقتدار میں حصہ ملے۔ بادشاہت نے تجارت پر جو پابندیاں لگائی ہوئی ہیں وہ سب ختم ہوجائیں۔ لہذا روشن خیالی (Enlightenment) کا زمانہ وہ تھا جب لبرلز ریاست کے خلاف لڑ رہے تھے۔ بعد میں وہ خود ہی اسٹیبلشمنٹ بن گئے۔ وہ ریاست اور بادشاہ کی اجارہ داری کو ختم کرنا چاہ رہے تھے۔ اس میں بہت اہم پہلو یہ تھا کہ وہ اس زمانے کے کیتھولک چرچ کے سخت خلاف تھے کیونکہ چرچ اس زمانے میں ایک بہت بڑی فیوڈل طاقت تھی۔ یورپ کی ایک تہائی زمین ان کی ملکیت تھی۔ لبرلز کہتے تھے کہ چرچ کی مداخلت ریاست اور سیاست میں نہیں ہونی چاہیے۔ لہذا لبرلز سیکولرزم کے بہت قریب تھے۔ لیکن جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ تمام سیکولر لبرل نہیں ہوتے البتہ تمام لبرل سیکولر ضرور ہوتے ہیں۔ لبرلز میں یورپ کے بہت بڑے بڑے دانشوروں کے نام تھے نکولو مکیاولی، اراسمس، تھامس ہابز اور روسکا مزر کے نام لبرلزم کی ابتدا کرنے والوں میں شامل تھے۔

اگرچہ لبرل ازم کا اصل بانی جان لاک ہے۔ اسے لبرل ازم کا اصل بانی اور اس کے کتاب کو لبرلزم کی بنیادی کتاب سمجھا جاتا

ہے۔لبرل دانشوروں میں اور بہت سے لوگ شامل تھے مثلاً مونٹیسکیو، والٹئر کوئزے، ژاں زاک روسو، ڈینس ڈیڈرائے، ایڈم سمتھ، ڈیوڈ ریکارڈو، جیمز مل، جان اسٹیورٹ لاک اور میکس ویبر وغیرہ بڑے بڑے نام ہیں۔ پولیٹیکل سائنس اور سوشیالوجی کی کتابوں میں ان کے نام ضرور پڑھنے کو ملیں گے۔ فلسفے کی کتابوں میں بھی ان کا نام ضرور آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روشن خیالی کے زمانے کے بعد پوری دنیا کے اندر ان کا بہت بڑا انٹلیکچوئل اثر ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ آج دنیا کا سب سے مقبول فلسفہ لبرل ازم ہی ہے اور جان لاک اس کے بانی تھے۔

جان لاک نے کہا کہ انسان کو کچھ حقوق فطری طور پر حاصل ہیں ان میں زندہ رہنے، آزادی اور جائداد رکھنے کا حق شامل ہیں۔ زندہ رہنے کے حق کا مطلب ہے کہ اگر کوئی مجھے آ کر قتل کر دے تو یہ میرے فطری حق کی خلاف ورزی ہے۔ آزادی بھی میری ضرورت ہے۔ اور جائداد رکھنا بھی میرا فطری حق ہے؟ کہ جس چیز پر میں محنت کرتا ہوں وہ میری ہونی چاہئے۔ میں نے جائداد پر محنت کی، کوئی مجھ سے چھین لے تو یہ میرے ساتھ ظلم اور زیادتی ہے کہ اس نے میری محنت چھین لی ہے۔ جان لاک یہ کہتا تھا کہ ریاست کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کی زندگی، آزادی اور جائیداد کا تحفظ کرے۔ اس کے علاوہ ریاست کا کوئی کردار نہیں ہونا چاہیے جو ریاست یہ کردار ادا نہیں کرتی تو اس کے خلاف بغاوت کر دینی چاہئے۔ کیونکہ دراصل اس ریاست نے عوام کے خلاف بغاوت کی ہے تو عوام کو اس کے خلاف بغاوت کر دینی چاہئے۔ آپ یہ سن کر بڑے حیران ہونگے کہ جان لاک اپنے زمانے میں بہت انقلابی آدمی تھا۔ درحقیقت اس زمانے میں سارے لبرل بہت انقلابی ہوا کرتے تھے۔ آج کے لبرلز خواہ وہ پاکستان کے ہوں یا دنیا بھر کے، وہ کہتے ہیں کہ نہیں نہیں انقلاب نہیں ارتقاء چاہئے۔ مگر ابتدائی زمانے کے لیڈرز بڑے انقلابی تھے۔ مثال کے طور پر انہوں نے مسلح جدوجہد کی بھی حمایت کی تھی۔ یہ بات ایک تاریخی حقیقت ہے مثلاً گلوریس ریوولوشن 1688ء ایک مسلح بغاوت تھی۔ جس میں لبرلز نے اپنی حاکمیت قائم کی۔ 1776ء کے امریکی انقلاب میں تھامس پین اور تھامس جیفرے سن کا کردار انتہائی اہم تھا جو اس دور کے معروف لبرل تھے۔ یہ اپنے زمانے کے انقلابی لوگ تھے۔ 1789ء کا انقلاب فرانس کو کیسے بھلایا جا سکتا ہے۔ وہ تو تھا ہی ایک انقلاب جس کی قیادت بھی لبرلز نے کی۔ اس زمانے کے لبرلز انقلابی تھے۔ اس وقت جو انقلابی ہوا کرتے تھے وہ اپنے آپ کو لبرل کہا کرتے تھے۔ مگر اب ایسا نہیں ہے کوئی غلط فہمی میں نہ رہیں اب لبرل کہتے ہیں کہ نہیں انقلاب کی کوئی خاص ضرورت نہیں بس تھوڑی تھوڑی تبدیلی کر لیں تو معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔

انقلاب فرانس کے بعد انیسویں صدی میں ہم نے دیکھا کہ لبرلزم بڑی تیزی سے پھیلا اور اس نے اپنے آپ کو یورپ اور جنوبی امریکہ میں منوایا اور آہستہ آہستہ شمالی امریکہ میں بھی مقبول ہوا۔ بیسویں صدی میں تو لبرلزم بہت ہی کامیاب ثابت ہوا کیونکہ دونوں عالمی جنگوں میں لبرلز ان ممالک کی حمایت کر رہے تھے جو ممالک جیتے۔ پہلی دفعہ تو برطانیہ اور فرانس وغیرہ کا کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس وجہ سے جیتے کہ اس میں انہوں نے بڑی جان لگا کر جرمنی کو شکست دی لیکن دوسری دفعہ تو کامیابی کی وجہ سوویت یونین تھا۔ بنیادی طور پر سوویت یونین نے 200 فاشسٹ ڈویژنز کا مقابلہ کیا۔ فرانس، برطانیہ اور امریکہ کو تو 10 سے زیادہ ڈویژنز کا بھی مقابلہ نہیں کرنا پڑا تھا۔ تو یہ بہت زیادہ فرق تھا۔ مگر بہرحال لبرلز اس جانب تھے جو ممالک جیتے۔ اس کے بعد وہ اپنے ہی اتحادی یعنی سوویت یونین اور کمیونزم کے خلاف

ہو گئے۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران فاشزم کے خلاف لبرلز اور کمیونسٹوں کا اتحاد بھی رہا لیکن جنگ کے بعد یہ اتحاد ٹوٹ گیا جس کے نتیجے میں سرد جنگ کا آغاز ہوا۔ سرد جنگ کو سمجھے بغیر آپ بیسویں صدی کی سیاست کو نہیں سمجھ سکتے۔ سرد جنگ کے دوران بنیادی لڑائی لبرل ازم اور کمیونزم کے درمیان تھی۔ اسی سے آپ کو اس بات کا اندازہ بھی ہو جائے گا کہ لبرل ازم کے نظریئے کے دشمن کون ہیں؟ ان میں ایک جانب تو کمیونسٹ ہیں دوسری جانب قدامت پسند ہیں۔ قدامت پسند وہ ہیں جو بادشاہت وغیرہ کے حامی تھے۔ آج بھی قدامت پسند لبرل ازم کے خلاف ہیں۔ مارکسسٹ لیننسٹ تو لبرلزم کے ہیں ہی خلاف، سوشلسٹ بھی لبرل ازم کے خلاف ہیں۔ ایک اور قوت بھی لبرل ازم کے خلاف ہے یہ ریڈیکل نیشنلسٹ یا فاشسٹ ہیں۔ فاشسٹ بھی لبرلزم کو قبول نہیں کرتے۔

پچھلی صدی میں بڑے مشہور اور اہم لبرلز کے نام ملتے ہیں جن کا نام آپ نے سنا ہوگا، ان میں لڈویگ مائسیس ہیں۔ جب بھی کسی کو کمیونزم کے خلاف بات کرنا ہو اس کی کتاب مجھے بھیج دیتا ہے۔ فریڈرک ہائیک کی ''روڈ ٹو سرف'' بڑی مشہور کتاب ہے۔ کارل پوپر، آئن رینٹو، جان گارلتھ، ایزایا برلن، ملٹن وغیرہ اہم نام ہیں۔ مگر بیسویں صدی میں لبرلز میں بڑی تبدیلی یہ ضرور آئی ہے کہ اگرچہ آج بھی وہ کہتے ہیں کہ حکومت کا مسلم ہونی چاہیے مگر معاشی پالیسی کے حوالے سے کم از کم انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ کوئی فلاحی ریاست ہونا چاہئے۔ اگر کوئی فلاحی ریاست نہیں ہوگی تو سوشلسٹ اور کمیونسٹ سرمایہ داری نظام کا بھٹہ بٹھا دیں گے۔

اسی لیے انہوں نے شہری حقوق کی بات کی کہ مرد اور عورت کے حقوق برابر ہونے چاہئیں۔ نسلی امتیاز ختم کرنے کی بھی انہوں نے بات کی کہ امریکہ میں سیاہ فاموں کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے وہ ختم ہونا چاہیے۔ آخر میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ غریبوں کو بھی کچھ حصہ ملنا چاہئے کسی نہ کسی طریقے سے فلاحی ریاست قائم ہونا چاہئے۔ لبرلز کے لیے سب سے اہم ماڈل سکینڈے نیوین ممالک ہی ہیں۔ ناروے، سویڈن اور فن لینڈ وغیرہ کو وہ کہتے ہیں کہ یہ ماڈل سب سے اچھا ہے کیونکہ یہاں سرمایہ داری بھی ہے، سرمایہ دار بھی منافع کما سکتا ہے اور مزدور کے حالات زندگی بھی اچھے ہیں، ان کو انسانی سہولیات ملتی ہیں۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ مزدور طبقے کے حالات زندگی شاید کسی اور ملک میں اتنے اچھے نہیں جتنا کہ وہاں پر ہیں۔

سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ لبرل ازم کی معاشی پالیسی اس طرح دنیا پر چھا چکی ہے کہ قدامت پسند حتی کہ پاکستانی قدامت پسند بھی اور وہ بھی جو یہ کہتے ہیں کہ مغربی جمہوریت وغیرہ سب ڈرامہ ہے ہم نے تو شریعت نافذ کرنی ہے یا خلافت لے کر آنی ہے اس کے اسیر ہیں۔ جب ان سے پوچھا جاتا ہے کے آپ کی معاشی پالیسی کیا ہوگی؟ آپ کا معاشی نظام کیسا ہوگا؟ تو وہ یہی جواب دیتے ہیں کہ فری مارکیٹ اکانومی ہوگی مگر اس میں فلاحی ریاست ہوگی۔ ریاست شہریوں کی بنیادی ضروریات کا خیال رکھے گی مگر اس کے ساتھ ساتھ سرمایہ دارانہ نظام بھی چلتا رہے گا۔ اس سے دلچسپ بات یہ سامنے آئی کہ لبرلزم کے سب سے بڑے مخالفین جن میں قدامت پسند اور مذہبی بنیاد پرست بھی شامل ہیں اور جو آج بھی یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ مذہبی حکومت قائم ہو جائے گی اور سیکولرزم کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لبرل ازم اور جمہوریت کا خاتمہ ہو جائے گا اور خلافت قائم ہو جائے گی۔ مگر معاشی اعتبار سے ان میں اور لبرلز میں قطعی طور پر انیس بیس کا بھی فرق نہیں ہے۔ دونوں کی معاشی پالیسیاں یا معاشی ماڈل ایک ہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ عین اسلام کے مطابق ہے اور لبرلز ہنس

کے کہتے ہیں کے اصل میں تو یہ ہمارا دیا گیا نظام ہے۔ آپ نے اگر چہ اس کو اپنا لیا ہے مگر یہ تو ہمارا ماڈل تھا۔ بہر حال معاشی پالیسی کے حوالے سے اگر کوئی لبرلز سے اختلاف کرتا ہے تو وہ اسلامی بنیاد پرست نہیں ہیں اور نہ مسیحی بنیاد پرست ہیں۔ وہ نہیں ہے جو مذہبی ریاست بنانا چاہتے ہیں بلکہ وہ سوشلسٹ ہیں جو کہتے ہیں سارا سرمایہ دارانہ نظام ہی ختم ہونا چاہیئے۔

امید ہے اس بحث سے آپ کو ان فلسفیانہ نظریات میں فرق سمجھ آ گیا ہوگا۔ سیکولرازم ایک وسیع اصطلاح ہے۔ تمام لبرلز اگر چہ سیکولر ہوتے ہیں لیکن تمام سیکولر لبرل نہیں ہیں۔ سوشلسٹ بھی اپنے آپ کو سیکولر کہتے ہیں۔ لبرلز کے یہ کہتے ہیں کہ حکومت کے پاس کم سے کم اختیارات ہونے چاہئیں، سرمایہ داری نظام قائم رہے البتہ کچھ فلاحی اصلاحات کر دی جائیں۔ سرمایہ داری نظام کو قائم رکھنے پر لبرل اور قدامت پسند متفق ہیں۔ دونوں سرمایہ دارانہ نظام کے حمایتی ہیں۔ پوری اسلامی بنیاد پرستی کی تحریک حسن البنا سے لے کر مولانا مودودی تک، اور آج کے دور کے بنیاد پرست خاص طور پر شہری (Urben) بنیاد پرست سرمایہ داری کے حامی ہیں، دیہی (Rural) بنیاد پرست کچھ اور کہتے ہیں۔ جیسے تحریک طالبان پاکستان تھی، ان کو اندازہ بھی نہیں کہ سرمایہ داری ہوتی کیا ہے؟ فلاحی ریاست کیا ہے؟ مگر پڑھے لکھے مذہبی پارٹیوں کے سکالرز یہی کہتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام فلاحی ریاست کے ساتھ ہونا چاہیئے۔

اس سے فرانسس فوکویاما کی ایک بات درست ثابت ہوتی ہے کہ شاید ہم تاریخ کے اختتام پر پہنچ گئے ہیں کہ لبرل ازم کے مخالفین نے بھی معاشی اعتبار سے لبرل ازم کو قبول کر لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنیاد پرستوں اور لبرلز کے درمیان اکثر جو لڑائی ہوتی ہے وہ معاشی نظریات پر نہیں ہوتی کیونکہ اس معاملے میں ان کے درمیان کوئی فرق ہے ہی نہیں۔ ان کے درمیان ثقافتی لڑائی ہوتی ہے۔ ان کی سیاسی لڑائی بھی نہیں ہوتی۔ ریاست کے ڈھانچے پر ان کے درمیان کوئی بڑے اختلافات باقی نہیں رہے۔ اسلامی بنیاد پرست پارٹیاں الیکشن اور پارلیمانی جمہوریت میں حصہ لیتی ہیں اور اس نظام کا دفاع کرنے کی بات بھی کرتی ہیں۔ مثلاً پاکستان ڈیموکریٹک موومنٹ کی قیادت مولانا فضل الرحمٰن کر رہے ہیں۔ وہ جمہوریت کی بات کر رہے ہیں ہر جگہ عوام کی رائے اور عوام کے ووٹ کے احترام کی بات کرتے ہیں۔ گویا وہ اس جمہوری فریم ورک کو قبول کرتے ہیں سیاسی طور پر وہ اس بچے کو قبول کرتے ہیں جو لبرل ازم نے دیا ہے اور معاشی لحاظ سے بھی اس نظام کو قبول کرتے ہیں جو لبرل ازم نے دیا ہے۔ صرف ثقافتی ڈھانچے کو قبول نہیں کرتے کہ عورتوں کے کپڑے کیسے ہونے چاہئیں، مردوں کا رویہ کیا ہونا چاہیئے، شادی بیاہ وغیرہ کیسے کرنے چاہئیں، بچوں اور بڑوں کے ساتھ کیسے تعلقات رکھنے چاہئیں۔ ان چیزوں پر ان کا اختلاف ہے، باقی چیزوں پر ان کا اتفاق ہے۔ لیکن سوشلسٹ اسی بات پر زور دیتے ہیں کہ معاشی نظام ہی جب تک آپ نے ٹھیک نہیں کرنا تو باقی چیزوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ باقی معاملات پر آپ کھیلتے رہیں گے کہ آج میں نے شرٹ نیلی پہننی ہے، پیلی پہنی ہے یا لال پہننی ہے۔ جب تک کہ معاشی نظام ٹھیک نہیں ہوگا اس سے کوئی بہت بڑا فرق نہیں پڑے گا۔ سیاست کی دنیا میں بنیادی تقسیم اس وقت یہی ہے۔

میں پوسٹ ماڈرنسٹ کیوں نہیں ہوں؟ -1

میرے ایک دوست نے میرے اوپر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ صرف یہ بتانا کافی نہیں ہے کہ میں لبرل کیوں نہیں ہوں بلکہ یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ میں لبرل ازم کی مخالفت کیوں کرتا ہوں۔ لہذا آج میں آپ کو نہ صرف یہ بتاؤں گا کہ پوسٹ ماڈرنسٹ کیوں نہیں ہوں ؟ بلکہ یہ بھی بتاؤں گا کہ میں پوسٹ ماڈرنزم کی مخالفت کیوں کرتا ہوں؟ پوسٹ ماڈرن ازم کی تعریف میں آپ کے سامنے پیش کر دیتا ہوں تا کہ یہ واضح ہو جائے کہ پوسٹ ماڈرنزم کیا ہے۔ ماڈرن ازم کا اردو میں ترجمہ جدیدیت کیا جاتا ہے اور اس لحاظ سے پوسٹ ماڈرنزم کا ترجمہ ہم مابعد جدیدیت کر سکتے ہیں۔ پوسٹ ماڈرنسٹ لکھاریوں کا لکھنے کا انداز اتنا مشکل ہے کہ اکثر لوگوں کو سمجھ ہی نہیں آتی کہ وہ کہ کیا رہے ہیں۔ مجھے وہ لطیفہ یاد آ گیا کہ جب ایک ان پڑھ شخص ولایت کیا جب گھر واپس آیا تو اس کے دوستوں نے پوچھا کہ ولایت آپ کو کیسا لگا۔ کہنے لگا بہت زبردست وہاں بہت بڑے لکھے لوگ ہیں بچہ بچہ انگریزی بولتا ہے۔ چونکہ اس شخص کو انگریزی سمجھ نہیں آ رہی تھی اس لیے وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ شاید ہر شخص کوئی بہت ہی ذہانت آمیز گفتگو کر رہا ہے۔ میرے نزدیک پوسٹ ماڈرن ازم کی مثال اس ننگے بادشاہ جیسی ہے جس نے فرمائش کی تھی کہ اس کے لیے ایسا نفیس لباس تیار کیا جائے کہ اسے جسم پر پہنا ہوا محسوس ہی نہ ہو۔ درزی نے اس کے جسم کے قریب قینچی وغیرہ چلا کر ظاہر کیا جیسے اس نے لباس بنا دیا ہے۔ حالانکہ بادشاہ ننگا تھا جب باہر آیا تو اس کے رعب و دبدبہ کی وجہ سے کسی کی جرات نہ ہوئی کہ اصل حقیقت کی طرف اشارہ کر سکتا۔ صرف ایک بچے نے کہا کہ اوئے بادشاہ تو ننگا ہے اور ہنسنا شروع ہو گیا۔ پوسٹ ماڈرن ازم کی بھی یہی مثال ہے کہ ہر بندہ کہہ رہا ہے کہ یہ تو بڑی زبردست چیز ہے کیونکہ ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ یہ ہے کیا۔ مگر درحقیقت آپ اس کی اصطلاحات اور لسانیات کو ایک جانب کر دیں اور حقیقی بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کریں تو آپ حیران ہوں گے کہ جو بات کہی جا رہی ہے وہ کیسی عجیب و غریب اور ردانقلابی بات ہے۔

پوسٹ ماڈرنزم کا رجحان 1970ء کے عشرے میں شروع ہوتا ہے جب مشال فوکو اور جیک ڈریڈا اور امریکہ کے اندر رچرڈ روٹی اور جوڈتھ بٹلر لکھنا شروع کرتے ہیں۔ کونٹینٹنگ فلاسفی سے یہ شروع ہوتا ہے۔ خاص طور پر فرانس سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ پوسٹ ماڈرنزم کا خاص نشانہ روشن خیالی (Enlightenment) کی اقدار تھیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مارکسزم کی اقدار بھی روشن خیالی کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں لہذا ہم مارکسزم کو بھی چیلنج کر رہے ہیں۔ لبرلزم، مارکسزم، روشن خیالی، ریشنلزم، سائنس، یہ سب چیزیں اور خاص طور پر مارکسزم پوسٹ ماڈرنزم کا ٹارگٹ تھا۔ ان کے دلائل کی فہرست طویل ہے لیکن ان کے جو تین بنیادی سوالات ہمیں ملتے ہیں وہ ہم بیان کرتے ہیں۔

سب سے پہلی اور اہم بات پوسٹ ماڈرنسٹ جو کرتے ہیں وہ یہ کہ سچائی یا حقیقت کا کوئی وجود نہیں۔ کوئی معروضیت نہیں ہے۔ آپ دنیا کا معروضی طور پر مطالعہ نہیں کر سکتے۔ آپ حقیقت کو نہیں جان سکتے۔ کیونکہ کوئی معروضیت نہیں ہے، کوئی سچائی نہیں ہے لہذا کوئی سائنس بھی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ سائنس کی بنیاد ہی معروضیت پر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر چیز موضوعی ہے معروضی حقیقت کوئی نہیں۔ جو کچھ میرے تصور

میں ہے اور جو کچھ آپ کے تصور میں ہے یہ محض تصور ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ تصورات کی کوئی مادی بنیاد نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب ہے سب کچھ موضوعی ہے۔ میرے لئے ایک سچ ہے آپ کے لئے اس سے الگ چیز سچ ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ دن ہے یہ حقیقت آپ کے لئے سچ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ رات ہے یہ حقیقت میرے لیے سچ ہے۔ میرا سچ بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ کسی دوسرے کا سچ۔ اس کا مطلب ہے تمام بیانیے جو ہمیں ملتے ہیں: سوشلزم بڑی اچھی چیز ہے، سیکولرزم بڑی اچھی چیز ہے، لبرلزم بڑی اچھی چیز ہے، سائنس بڑی اچھی چیز ہے، مذہب بڑی اچھی چیز ہے، فیمنزم بڑی اچھی چیز ہے۔ دنیا کے کے تمام بیانیے جو موجود ہیں، کسی ایک بیانیے کو دوسرے پر معروضی فوقیت حاصل نہیں ہے۔ کوئی بھی ایک بیانیہ دوسرے بیانیے سے زیادہ سچائی یا حقیقت کے قریب نہیں ہے۔ یہ تصور ہی کر لینا کہ ایک بیانیہ دوسرے بیانیے کی نسبت حقیقت سے زیادہ قریب ہے۔ یہی سب سے بڑا فراڈ ہے اور یہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اگر حقیقت اور بیانیے کا آپس میں کوئی تعلق نہیں اور کوئی بیانیہ ایک دوسرے بیانیے کی نسبت حقیقت کے زیادہ قریب یا زیادہ دور نہیں تو سماجی قوت کس چیز پر بنیاد رکھتی ہے۔ ان کا خیال ہے کیونکہ قوت کی کوئی معروضی بنیاد نہیں۔ اس کی بنیاد محض موضوعی ہو سکتی ہے۔ معروضی بنیاد قوت اقتدار کی نہیں ہے بلکہ اقتدار کی بنیاد مصنوعی ہے، موضوعی ہے اور چونکہ ہم اپنی موضوعیت کا زبان کے ذریعہ اظہار کرتے ہیں اور خود زبان کی اصل بنیاد موضوعی ہے تو قوت کی اصل بنیاد زبان ہی ہے۔ یعنی کہ سماجی، سیاسی اور معاشی اقتدار جن لوگوں کے پاس ہے وہ اقتدار ان کے پاس قوت کی بنیاد پر، معیشت کی بنیاد پر، اجارہ داری کی بنیاد پر یا سیاسی اداروں پر حاکمیت کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ ان کا جو اصل اقتدار ہے وہ زبان اور تصورات (Concepts) پر ان کے اقتدار کی بنیاد پر ہے۔

جس طرح سے ہم اپنی قوت کا اظہار زبان کے ذریعے کرتے ہیں۔ اسی سے معاشرے کے اندر ہمارے اقتدار کے تعلقات قائم ہوتے ہیں اور اسی میں سارا راز چھپا ہوا۔ اب اس راز کو فاش کرنے کے لئے تیسرا نکتہ یہ کہ ہمیں بائنری سوچ (Binary Thinking) سے باہر آنا پڑے گا۔ یہ کہنا کہ باہر دن ہے یا باہر رات ہے یہ بائنری انداز فکر ہے۔ یہ کہنا کہ صرف رات ہو سکتی ہے یا صرف دن ہو سکتا ہے درست انداز فکر نہیں ہے۔ اشیا کو صرف دو تضادات کے حوالے سے نہیں دیکھا جانا چاہئے۔ بائنری سوچ ایک منفی تصور ہے جو جدلیات کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اسے کسی اور وقت بیان کریں گے۔ دوسرا یہ کہ ہمیں لازمیت (Essentialism) سے دور ہونا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم ایک Diverse Phenomenon کو لے کر صرف اس کے اسینس کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسینسز فلاسفی کی بنیاد رہی ہے۔ مثلاً افلاطون نے بھی کہا ہے سب سے پہلے ارسطو نے کہا کہ ہمیں اشیاء کے اسینس کو تلاش کرنا ہے۔ مثلث کی اصل (اسینس) کیا ہے؟ مربع کی اسینس کیا ہے؟ انسان کی اصل کیا ہے؟ پھر ارسطو نے یہی بات کی حسن سے اس کے اندر موجود ہے۔ افلاطون نے کہا کہ وہ ٹرانسٹنڈل ہے۔ فلسفے اور سائنس کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اشیاء کی اسینس کو سامنے رکھے ان کی بنیاد کو سمجھا جائے۔ مگر وہ کہتے ہیں کچھ چیزوں کی بنیاد کو نہیں سمجھنا۔ ہمیں ان کو ٹھوس بنیادوں پر سمجھنا ہے۔ ان کے وجود کو سامنے رکھنا ہے ان کی بنیاد پر نہیں جانا بلکہ ان کی کمپلیکسٹی کو سامنے رکھنا ہے۔ تیسری بات وہ کہتے ہیں کہ وہ فلاسیفکل ڈیٹرمنزم کے سخت خلاف ہیں۔ یہ تصور کہ کاز ہمیشہ ایک ایفکٹ کرتا ہے اور وہ لازمی طور پر ایفکٹ کرتا ہے۔ اس کے بھی وہ خلاف ہیں اور یہ کہ سماج کے اندر جو کچھ ہو رہا ہے چند وجوہات

کواس کی بنیاد قرار دینا خواہ وہ معاشی ہو یا سیاسی ہو یا کوئی اور اس قسم کی وجوہات ہو جس سے بہت وسیع اور کمپلیکس فینومینا کی وضاحت کریں اس کو وہ ڈٹرمنزم قرار دیتے ہیں کہ آپ بہت ہی وسیع فنومینا کو سکیڑ رہے ہیں اور چند چیزوں سے بہت زیادہ چیزوں کی وضاحت کر رہے ہیں۔ یہ چیزیں بنیادی سائنس کا حصہ ہے کہ آپ جب بھی کوئی سائنسی تجزیہ کرتے ہیں تو آپ اس کی کمپلیکسٹی سے ایبسٹریکٹ تھنکنگ کی طرف جاتے ہیں۔ ایبسٹریکشن از بائی ڈیفینیشن از ڈٹرمنزم اینڈ ریڈکشنزم۔ بہرحال وہ اس کو ایسے نہیں دیکھتے وہ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ غلط ہے۔ آل کنسیپٹس ان لینگویج آر ڈٹرمینٹک اینڈ ریڈکشنسٹک۔ کیونکہ اگر میں ایک لفظ بھی بولتا ہوں تو ریڈکشنسٹ ہوں کہ بہت سارے کمپلیکس آئیڈیاز کی وضاحت کرنے کے لئے میں نے انہیں ایک لفظ کے اندر ریڈیوس کر دیا ہے۔

بہرحال میں بہت زیادہ فلسفیانہ بحث میں الجھ گیا ہوں۔ اب اس سے باہر آنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تو یہ ان کا نقطہ نظر ہوا کہ دنیا کے اندر نہ کوئی سچ ہے نہ کچھ جھوٹ ہے۔ اب آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی نہیلسٹک ہے یعنی بے معنی ہے۔ زندگی کا کوئی معنی نہیں ہوسکتا۔ آپ اپنی زندگی کو کوئی معنی دینا چاہتے ہیں تو دے دیں کوئی مسئلہ نہیں۔ مگر انسانیت کی زندگی کا نہ تو کوئی معنی ہے اور آپ اگر اپنی زندگی کو کوئی معنی دینا چاہتے ہیں اور میں اپنی زندگی کو کوئی معنی نہیں دینا چاہتا ہوں تو نہ آپ کا معنی مجھ سے بہتر اور نہ میرا مقصد آپ سے بہتر ہے۔ کیونکہ کوئی مقصد دوسرے سے بہتری یا ابتری یا برتری حاصل نہیں کر سکتا۔ مزید اس سے جو نتائج ملے ہیں وہ یہ کہ زندگی بے معنی ہے اس لیے جو ہم یہ سیاست میں جاتے ہیں اور کام کرتے ہیں اور سیاسی پارٹی بناتے ہیں یہ بڑا آکسی ڈیس میتھڈ ہے۔ یہ بڑا عجیب وغریب قسم کا ہمارے پاس اختیار ہے جس کے ذریعے دراصل ہم لوگوں کو کنٹرول کرتے ہیں۔ کتنا ہم اس کے اندر گھستے چلے جاتے ہیں اتنا ہی ہم اس پروسس کے اندر پھنس جاتے ہیں۔ ہمیں اس پراسیس سے باہر نکلنے کی ضرورت ہے۔ پوسٹ ماڈرنسٹ نظریات سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ جو بڑی مین سٹریم سیاست ہے اس کے اندر تو داخل ہونا ہی نہیں چاہئے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ اس کی جگہ ہمیں مائیکرو سیاست کرنی چاہیے۔ مائیکرو سیاست کو ہم شناختوں کی سیاست کہتے ہیں۔ میری شناخت مرد ہے، آپ کی شناخت عورت ہے۔ کسی کی شناخت پنجابی ہے، کسی کی شناخت استاد کے طور پر ہے، کوئی اردو سپیکنگ ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح سے پوسٹ ماڈرنسٹ مفادات کی بہت سی لہریں بنا دیتے ہیں۔ پرویلجز کس طرح سے میرے پرسنل انٹرایکشن کو متاثر کرتے ہیں۔ اسی پر ساری سیاست کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ شناخت کی سیاست کا صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ ساری سماجی اجتماعیت کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہے اور اور اجتماعیت کو فردیت میں تبدیل کر دیتی ہے۔ کیونکہ کوئی ایک بیانیہ دوسرے سے بہتر نہیں تو کون سا بیانیہ آپ اپناتے ہیں یہ آپ کی اپنی مرضی ہے۔ اس پوسٹ ماڈرن سیاست کے خالی پن کے اندر آپ کا جو دل چاہے آپ بھر سکتے ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ تمام انسان برابر ہوں تو آپ اس کے اندر ایگلیٹیرین بھر سکتے ہیں۔ اگر آپ اس کے اندر فاشزم بھرنا چاہتے ہیں تو وہ بھی اس کے اندر بھرنا آسان ہے۔ اگر آپ اس کے اندر ایک مذہبی ریاست بنانا چاہتے ہیں تو پوسٹ ماڈرنزم اس کے لئے بھی اسی طرح کھلا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فوکو نے ایران میں آیت اللہ خمینی کے انقلاب کی مکمل حمایت کی۔ حالانکہ وہ فرانس میں قدامت پسندی کا انتہائی مخالف تھا لیکن ایران میں اس نے قدامت پسندوں کی حمایت کی۔

پوسٹ ماڈرنسٹ ہمیں اسی طرح نظر آتے ہیں۔عراق جنگ کے وقت آدھے پوسٹ ماڈرنسٹ ایک جانب کھڑے ہیں تو باقی آدھے دوسری جانب کھڑے ہیں۔ان کی کوئی یکساں سیاست نہیں ہے۔یہ یکسانیت اس لیے نہیں پیدا ہوتی کیونکہ کوئی بھی ایک پوزیشن دوسری سے نہ بری ہے نہ اچھی ہے تو آپ کوئی بھی پوزیشن لے لیں۔ہر چیز کا برابری کی سطح پر دفاع کیا جاسکتا ہے۔ایک بندہ اگر یہ کہ رہا ہے کہ پدرسری بہت بری چیز ہے تو دوسرا یہ کہ سکتا ہے کہ جی یہ تو بڑی اچھی چیز ہے۔پوسٹ ماڈرنزم بذات خود آپ کو گائیڈ نہیں کرسکتا کہ کون سا بیانیہ بہتر ہے اور کون سا برا ہے۔حالانکہ جنڈر سٹڈیز میں اس وقت پوسٹ ماڈرنسٹ بہت غالب ہیں۔جب فوکو سے کسی نے پوچھا کہ جناب آپ کے پاس تو پھر کوئی حل ہوتا ہی نہیں تو اس پر فوکو نے یہ جواب دیا کہ میرا تو یہ کام ہی نہیں کہ میں آپ کو حل بتاؤں۔میں تو بس یہ سمجھتا ہوں کہ چیزوں پر سوال اٹھانے چاہئیں۔الٹی میٹ کیپٹسزم کی پوزیشن اختیار کی۔مگر جب پوسٹ ماڈرنزم کی بالعموم کلی تصویر کے سامنے آتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا بنیادی مقصد جنسی آزادی بن چکا ہے۔فوکو نے خود بھی جنس اور جنسیت کے حوالے سے بہت کچھ لکھا۔دیگر لوگوں نے بھی بہت کچھ لکھا۔جب جنرل اسٹیڈیز کا فوکس جنسیت کی طرف مڑا تو جنڈر سٹڈیز پر فوکو کے بہت گہرے اثرات رہے کیونکہ وہ جنسیت کا مطالعہ کررہے تھے۔ان کا فرائیڈ کے ساتھ جڑ کے جو بنیادی مقصد بن چکا ہے وہ یہی ہے کہ وہ ایک جنسی انقلاب چاہتے ہیں جس میں ہر انسان کم از کم جنسی گھٹن (Repression) سے آزاد ہو سکے اور ان کے خیال میں یہی گھٹن دیگر بہت سے گھٹن اور استحصال کی بنیاد ہے۔

یہاں پر ایک اور لطیفہ یاد آیا کہ ایک دفعہ کہیں محنت کشوں کی میٹنگ ہو رہی تھی۔اس میں ان کی تنظیم کا منشور لکھا جارہا تھا۔پوچھا گیا کہ اس میں آپ نے Gays کے بارے میں بیان کیا ہے؟ جواب ملا نہیں۔کہا گیا اس حوالے ضرور کچھ لکھ دیں۔پھر پوچھا گیا کیا اس میں آپ نے Lesbians کے حوالے سے کچھ لکھا ہے؟ جواب اس مرتبہ بھی نہیں تھا تو کہا گیا اس حوالے سے بھی آپ کچھ لکھ دیں۔پھر پوچھا گیا کہ تیسری جنس کے حوالے سے آپ نے اس منشور میں کچھ لکھا ہے؟ جواب پھر نہیں میں تھا۔اس حوالے سے بھی منشور میں اضافہ کروادیا گیا۔خواتین کے حقوق کے بارے میں بھی کہا گیا کہ اس حوالے سے بھی کچھ لکھ دیں۔پیچھے ایک ورکر بیٹھا ہوا تھا اس نے تنگ آکر کہا کہ اچھا یار اب ان لوگوں کے بارے میں بھی کچھ لکھ دو جو کام کرکر کے اتنا تھک جاتے ہیں کہ کسی کے ساتھ سیکس کرنے کے قابل ہی نہیں رہتے۔

اگرچہ یہ صرف ایک لطیفہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب میں پوسٹ ماڈرنسٹ سیاست پر جنس کا موضوع حاوی رہا ہے۔معاشی اور سیاسی سوالات پر اگر انہوں نے کبھی غور کیا بھی ہے تو اسی نقطہ نظر سے غور کیا ہے۔ان موضوعات پر کبھی سائنسی انداز میں یا آزادانہ غور نہیں کیا گیا۔وہ کر بھی نہیں سکتے کیونکہ اگر آپ یہ پوچھیں کہ پاکستان میں خواندگی کی شرح کیا ہے؟ مردوں میں خواندگی کی شرح کیا ہے؟ اور خواتین میں خواندگی کی شرح کیا ہے؟ تو وہ یہ کہیں گے کہ شرح خواندگی؟ یہ تصورات لوڈڈ ہیں ہم ان کو قبول ہی نہیں کرتے۔آپ جو چارٹ بنا رہے ہیں اور ڈیٹا اکٹھا کررہے ہیں یہ سب ایک سائنسی پیراڈائم ہے جس میں آپ ایک معروضیت کا دعوی کررہے ہیں۔ہم تو اس معروضیت کو مانتے ہی نہیں۔یہ آپ کا بیانیہ ہے۔ہوسکتا ہے ہم آپ کے بیانیے کو قبول کریں کیونکہ آپ یہ دعوی کررہے ہیں کہ غریبوں کو تعلیم

ملنی چاہیے مگر ہمارے لیے ضروری نہیں کہ ہم اس بیانیے کو کسی اور بیانیے سے بہتر سمجھیں۔

پوسٹ ماڈرن سوچ کے ارتقاء کی اگر ہم بات کریں تو تو اس تصور کے ڈانڈے اس وقت سے ملتے ہیں جب انلائیٹنمنٹ ہو رہی تھی۔اس کے خلاف ایک لہر ابھری جسے ہم کاؤنٹر انلائیٹنمنٹ کہتے ہیں۔ یہ لہر زیادہ مضبوط نہیں تھی، روشن خیالی زیادہ مضبوط تھی لیکن زیر سطح یہ روشن خیالی کو چیلنج کر رہی تھی۔ بہت سی کاونٹر انلائیٹنمنٹ کی اقدار اور اصولوں کو پہلے فریڈرک نیچے نے اختیار کیا۔اس کے بعد ہائیڈگر کا نام آتا ہے۔ ہائیڈگر سے فوکو نے ان کو اختیار کیا۔اس طرح جرمنی کے کاؤنٹر انلائیٹنمنٹ تصورات فرانس کے ذریعے سفر کرتے ہوئے امریکن اکیڈمی پہنچ گئے۔اگر اس انٹرنیشنل سفر کے حوالے سے آپ پڑھنا چاہتے ہیں تو آپ ایک کتاب Seduction of Unreason ضرور پڑھیں۔ایک شاندار کتاب ہے۔آخر میں یہ کہوں گا کہ میں پوسٹ ماڈرنسٹ بالکل نہیں ہوں کیونکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ارسطو نے ہی اس قسم کے Solapsism یا Sophism کا بہترین جواب دے دیا تھا۔ ان کے مطابق اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ سچائی جیسی کوئی حقیقت نہیں تو آپ ایک حقیقت ہی بیان کر رہے ہیں۔اگر آپ یہ کہہ رہے ہیں سچائی جیسی کوئی چیز نہیں تو آپ بھی سچ نہیں کہہ رہے۔ کیونکہ سچائی کا کوئی وجود ہی نہیں۔اگر آپ نے کہا کہ کوئی سچائی نہیں ہے تو یہ سچائی بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ کوئی سچائی ہے ہی نہیں۔ دوسری بات یہ ہوگی کہ اگر ہم سب کچھ موضوعی کر دیں تو اس کا جواب سقراط نے دو ہزار چھے سو سال قبل دے دیا تھا کہ ہمارے پاس کوئی بنیاد ہی نہیں ہے کہ ہم کہ سکیں کہ آپ کی بات حقیقت کے زیادہ قریب ہے یا میری بات حقیقت کے زیادہ قریب ہے۔ بلکہ ہم ایک ایسی صورتحال میں پھنس جاتے ہیں جہاں پر حقیقت پر اتفاق ہی نہیں کر سکتے کہ حقیقت ہے بھی یا نہیں۔ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ سب کچھ جو میں دیکھ رہا ہوں وہ ایک خواب ہے اور اس دنیا میں، میں ہی خواب دیکھ رہا ہوں۔

صرف اور صرف میں ہی ہو یعنی کہ آپ ایسی فلاسفیکل پوزیشن پر آجاتے ہیں جس میں آپ ثابت ہی نہیں کر سکتے کہ آپ کے علاوہ دنیا میں کوئی اور ہے بھی یا نہیں۔اسے Solipsism کہتے ہیں۔ یہاں سے ڈیکارڈ اپنی فلاسفی کو اسی چیز کو رد کرتے ہوئے شروع کرتا ہے۔ پھر آپ یہ کہتے ہیں کہ مقتدرہ (Power Relations) کو زبان طے کرتی ہے تو دنیا میں ایسا کہیں پہ نظر نہیں آتا۔آپ تاریخ میں دیکھ سکتے ہیں کہ جو لوگ بادشاہ کی بات نہیں مانتے انہیں زبانوں کے ذریعے نہیں بلکہ ہتھیاروں کے ذریعے قائل کیا جاتا ہے۔جسمانی طور پر ختم کر دیا جاتا ہے۔ جو غلام بنے انھیں کسی طرح چھوٹے چھوٹے کیمپس میں جانوروں کی طرح رکھا گیا، ان کی تجارت کی گئی اور کس طرح امریکی سہولیات اور عیش و آرام غلاموں کی تجارت پر بنیاد رکھتے ہیں۔غلاموں کو زبان سے قائل نہیں کیا گیا تھا کہ تم ہمارے غلام بن جاؤ۔ان کو طاقت سے قائل کیا گیا تھا۔ان کو بیڑیاں لگائی گئی تھیں، ان کو مارا گیا تھا۔ مغل سلاطین کو انگریزوں نے لفظوں سے قائل نہیں کیا تھا۔فوج کے ذریعے ان کو فتح کیا گیا تھا۔

دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں جو تصور ہوتا ہے دراصل اس کے پیچھے ایک Hegemonic سیاسی طاقت ہوتی ہے اور جب تک وہ سیاسی طاقت قائم نہیں ہوتی تو نظریاتی Hegemony بھی ٹھیک قائم نہیں ہوتی۔ پولیٹکل سائنس تو ہمیں یہی بتاتی ہے کہ قوت کی بنیاد آپ کے ہتھیار ہیں، فوج ہے اور فوج اور اس کے ہتھیاروں کے لئے آپ کو منظّم معاشی طاقت چاہئے۔ سیاسی قوت کا انحصار فوجی

طاقت پر ہے اور فوجی طاقت کا انحصار معاشی طریقہ پیداوار پر ہے۔ بہر حال پوسٹ ماڈرنسٹ اس بات کو قبول نہیں کرتے۔ آخر میں یہ کہ بائنری سوچ ایسنشیلزم، رڈکشنزم اور ڈیٹرمنزم، میں سمجھتا ہوں کہ ایسینشیل ایپسٹریکشن کے ذرائع ہیں۔ اس کے بغیر نظریاتی ایپسٹریکشن نہیں ہوسکتی۔ جب تک نظریاتی ایپسٹریکشن نہیں کرسکتے تو آپ بات نہیں کرسکتے۔ پہلی جماعت سے آپ یہ متضادات پڑھ رہے ہیں کہ دن رات، زندگی موت، مرد عورت، رنگ بے رنگ وغیرہ وغیرہ۔ جو ابھی آپ نے متضادات پڑھے اور آپ نے اس چیز کو پہچانا کہ دنیا کے اندر بڑی سطح پر تضادات موجود ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے ہیگل سے بھی ہم یہ سبق سیکھتے ہیں۔ ہیریکلائٹس سے ہم سیکھتے ہیں کہ یہ متضادات ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ ایسی بھی حقیقت Realm ہے جہاں دو متضادات ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتے ہیں (Fuse). لیکن ان متضادات کے مل جانے سے یہ حقیقت ختم نہیں ہوجاتی کہ ان متضادات کا وجود موجود رہتا ہے۔ پوسٹ ماڈرنسٹ بار بار ایک ہی دلیل، ایک ہی منطق استعمال کرتے ہیں۔ افسوس سے کہا جاسکتا ہے کہ اسی میں بے وقوف بنتے جارہے ہیں کہ دو متضاد وجودوں کے درمیان ملاپ کا آپ درست وقت کا تعین نہیں کرسکتے۔ کہ دن رات میں کون سے سیکنڈ میں تبدیل ہوتا ہے۔ آپ صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ 6 بجے شام ہوتی ہے اور پھر رات ہوجاتی۔ 5 سے 6 کے درمیان شام ہوتی ہے۔ نہ دن ہوتا ہے نہ رات ہوتی ہے، آپ بس درمیان میں کہیں ہوتے ہیں اور اس کے بعد رات ہوجاتی ہے۔

لیکن کوئی بھی احمق یہ نہیں کہے گا کہ چونکہ آپ وہ لمحہ نہیں بتاسکتے کہ دن کس وقت رات میں تبدیل ہوا تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا کہ دن اور رات کے اندر کوئی فرق نہیں۔ جو دن اور رات کے اندر فرق نہیں جانتا ظاہر ہے وہ انتہائی جاہل آدمی ہے۔ اسی طرح ہم نے دیکھا ہے کہ پوری دنیا کے اندر پوسٹ ماڈرنزم جس جس چیز کے اندر گھسا ہے اس نے یہی کیا ہے۔ کچھ باتیں ایک چیز سے اٹھالیں کچھ دوسری چیز سے لے لیں اور کہا دیکھو یہ عناصر ان چیزوں میں مشترک ہیں اور آپ درست طریقے سے نہیں بتاسکتے کہ کون سے لمحے میں ایک چیز دوسری میں تبدیل ہوئی ہے لہذا متضادات کا تصور ہی غلط ہے۔ مثال کے طور پر اس میں یہ دلائل دیئے گئے کہ قدیم اور جدید معاشرے میں کوئی فرق نہیں، سیکولر اور مذہبی معاشرے میں کوئی فرق نہیں، فاشزم اور کمیونزم میں کوئی فرق نہیں، جمہوریت اور آمریت میں کوئی فرق نہیں، کسی چیز میں کوئی فرق ہی نہیں ہے کیونکہ ہر چیز میں کوئی نہ کوئی عنصر تو مشترک ہے۔ سائنس اور مذہب میں کوئی فرق نہیں، معروض اور موضوع میں کوئی فرق نہیں، ان لائٹنمنٹ اور کاؤنٹر انلائٹنمنٹ میں کوئی فرق نہیں، خواندگی اور ناخواندگی میں کوئی فرق نہیں، کسی چیز میں کوئی فرق آپ ثابت نہیں کرسکتے کیوں کہ آپ یہ دلیل ہر چیز پر لاگو کرسکتے ہیں کہ دونوں متضادات میں کوئی نہ کوئی چیز تو مشترک ہوگی۔ کوئی تو وہ پوائنٹ ہوگا جہاں ایک چیز دوسرے میں تبدیل ہوئی ہے۔ کیونکہ آپ اس پوائنٹ کی شناخت نہیں کرسکتے تو آپ کہہ دیتے ہیں کہ ان متضادات کا وجود ہی نہیں۔ یہ ایسے ہی ہے کہ میں اگر آپ سے یہ کہوں کہ میں آپ کے سر سے ایک ایک بال نکالتا چلا جاؤں اور آپ سے یہ پوچھوں کہ میں آپ کا کون سا بال نکالوں گا تو آپ گنجے ہوجائیں گے۔ آپ اس بال کا نمبر مجھے نہیں بتاسکتے کہ جناب جب آپ دس ہزارواں بال نکال دیں گے تو میں گنجا ہوجاؤں گا۔ اگر آپ ایسا کہیں گے تو میں کہوں گا دس ہزار ایک یا دس ہزار دو پر گنجا پن ہوا ہے۔ تیسرا کہے گا کہ آپ دس ہزار پانچویں بال پر گنجے ہوں گے۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ کس نمبر کے بال کے اوپر آپ گنجے ہوں گے۔ لیکن

کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ گنجے اور بال والے بندے کے اندر کوئی فرق نہیں ہے۔

اس قسم کی دلیل بار بار دہرائی جارہی ہے اور یہ ایک فضول قسم کی دلیل ہے۔لبرل ازم اور پوسٹ ماڈرنزم میں بہت بڑا فرق ہے۔لبرل یہ کہتے ہیں کہ ہم بائیں بازو کے ہیں ہی نہیں۔بائیں بازو کے لوگ بھی لبرلز کے ساتھ اپنے فرق کو پہچانتے ہیں۔بائیں بازو کے لوگ لبرلز کو قائل نہیں کر سکتے اور لبرلز بائیں بازو کے لوگوں کو قائل نہیں کر سکتے۔ان دونوں کے درمیان ان ایزی قسم کا بقائے باہمی (Stalemate) طے پاچکا ہے۔لیکن پوسٹ ماڈرنسٹ بائیں بازو کی جگہ لینے کی کوشش کررہے ہیں۔وہ لبرل نہیں بننا چاہتے۔لبرلز پر تو وہ تنقید کرتے ہیں۔وہ خود کو نیولیفٹ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔اس سے متاثر ہونے والے بہت سے نوجوانوں نے مارکسزم،سوشلزم اور ترقی پسند سیاست کو چھوڑ کے پوسٹ ماڈرن ازم کی سیاست اختیار کرلی ہے۔وہ شناخت کی سیاست کرتے ہیں ہے۔جس کا انتہائی نقصان بین الاقوامی طور پر بھی اور پاکستان کے اندر بھی نظر آرہا ہے اور نظر آتا چلا جائے گا۔کیونکہ یہ وہ سوچ ہے جو ری ایکشنری کاونٹر انلائٹمنٹ پر بنیاد رکھتی ہے۔یہ تحریکوں کی سالیڈیریٹی کو تباہ کرتی ہے۔ان کو ایسٹمائز اور ڈس آرگولیٹ کردیتی ہے۔ان کو بکھیر دیتی ہے۔بالآخر ان کو موضوعی بنادیتی ہے۔جس کی وجہ سے ہم کبھی بھی کوئی دو لوگ کسی ایک چیز پر متفق نہیں ہوسکتے۔لوگ کبھی ایک چیز پر اسی وقت متفق ہوں گے جب ان کے پاس متفق ہونے کی کوئی بنیاد موجود ہو اور وہ بنیاد صرف یہ ہوسکتی ہے کہ ہم تمام لوگ ایک ہی مادی دنیا کے اندر رہتے ہیں۔اس مادی دنیا کو سمجھنے اور اس کے رشتوں کو سمجھنے کے لئے سماجی رشتوں کو سمجھنا ضروری ہے تاکہ ہم ان کو سمجھ کے ان کو تبدیل کرسکیں۔

میں پوسٹ ماڈرنسٹ کیوں نہیں ہوں؟ -2

گزشتہ لیکچر میں آپ کو بتایا تھا کہ پوسٹ ماڈرن ازم یعنی کہ مابعد جدیدیت میں کیا مسائل ہیں؟ کیا خامیاں ہیں؟ اور میں اس کی کیوں مخالفت کرتا ہوں۔ اس لیکچر میں بھی میں اسی موضوع پر اظہار خیال جاری رکھوں گا اور مزید آپ کو بتاؤں گا کہ میں پوسٹ ماڈرن ازم کی مخالفت کیوں کرتا ہوں؟

میں نے آپ کو بتایا تھا کہ پوسٹ ماڈرنزم کا بنیادی طور پر یہ نقطہ نظر ہے کہ کوئی سچائی یا حقیقت موجود نہیں ہے۔ بلکہ ہر چیز ایک بیانیہ ہے۔ مختلف بیانیے ہیں اور کوئی بیانیہ حقیقت اور سچائی کے زیادہ قریب نہیں۔ اور دوسرا یہ کہ طاقت اور اقتدار کی بنیاد مکمل طور پر زبان اور موضوعیت پر ہے۔ تیسرا یہ کہ پوسٹ ماڈرنسٹ اسینشیلزم، ڈٹرمنزم اور رڈکشنزم وغیرہ کے خلاف ہیں اور انہیں مسائل کی جڑ سمجھتے ہیں۔ کچھ انٹلیکچوئل کے نام بھی میں نے آپ کو بتائے تھے۔ مثال کے طور پر فوکو، ڈریڈا، رچرڈ روہرٹی، جوڈتھ بٹلر وغیرہ۔ اسی خیال کو جاری رکھتے ہوئے آج میں فرانسس بین جو بڑا مشہور مارکسسٹ ہے۔ اس کی کتاب میں سے آج کچھ ڈیٹا لے کے آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ کتاب بڑی زبردست ہے۔ بہت مزیدار اور شاندار کتاب ہے۔ بہت اس میں معلومات ہیں۔ کتاب کا نام ہے

A Short History of Modern Delusions, How Mumbo Jumbo Conquered the World

، کہ کس طرح 1980ء کے بعد بہت سارے Dilliusins دنیا کے اندر پھیلتے چلے جا رہے ہیں اور پوسٹ ماڈرنزم بھی اس کا ایک حصہ ہے۔ یہ پوسٹ ماڈرنزم کہاں سے پھیلا؟ اور کہاں سب سے مضبوط تھا؟ بین ہمیں بتاتے ہیں کہ کون سی یونیورسٹی پوسٹ ماڈرنزم کا گڑھ اور منبع بنی۔ وہیں سے یہ خیالات پورے امریکہ کے اکیڈیمیا کے اندر پھیلتے چلے گئے کہ دنیا بنیادی طور پر ایک سوشل کنسٹرکٹ ہے۔ سوشلی کنسٹرکٹڈ ٹیکسٹ ہے۔ ٹیکسٹ کے باہر کچھ بھی نہیں۔ ٹیری ایگلٹن بہت اچھے مارکسسٹ ہیں۔ انہوں نے اس پر بہت کچھ لکھا۔ انہوں نے یہ بھی بیان کیا کہ سٹرکچرلزم، پوسٹ ماڈرنزم کس طرح ارتقاء پذیر ہوا۔ ٹیری ایگلٹن کا کہنا ہے کہ جو 1968ء میں فرانس کے اندر ایک بہت بڑی سٹوڈنٹ تحریک وجود میں آئی۔ اس گروپ میں یوفوریا بھی تھا ڈس الیوژن منٹ بھی تھی۔ یوفوریا اس لئے کہ اس تحریک میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ ڈس الیوژن منٹ اس لئے تھی کہ وہ کچھ حاصل نہیں کر سکے۔ آزادی کا ایک احساس بھی تھا اور یہ منتشر بھی ہوگئی۔ کارنیول اور کٹیسٹف جو اکٹھے ہوئے ٹیری ایگلٹن کے خیال میں اس کی وجہ سے پوسٹ سٹرکچرلزم پیدا ہوا۔ اسی میں سے پوسٹ ماڈرنزم نکلا۔ 1968ء کی موومنٹ کی کوشش یہ تھی کہ وہ ریاستی ڈھانچے کو توڑ ڈالیں۔ اس میں تو یہ کامیاب نہیں ہوئے۔ انہوں نے سوچا کہ ریاستی ڈھانچہ توڑنے میں تو ہم کامیاب نہیں ہوئے۔ چلو زبان اور لسانیات کے جو ڈھانچے ہیں ان ہی کو توڑ ڈالیں۔ وہ آزادی جو ان کو سیاست میں نہیں مل سکی، جو آزادی ان کو معیشت میں نہیں مل سکی وہ آزادی انہوں نے سوچا کہ شاید زبان کو توڑ مروڑ کر حاصل کر سکیں گے۔

مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی سیاست اس بری طرح سے بکھری کہ ان کی تفہیم کہ کسی معاشرے کے کیا ڈائنامکس ہیں اور کس طرح سے ان کو سمجھنا ہے یہ بالکل بے ترتیب ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب فوکو سے کسی نے پوچھا کہ جناب آپ ایران میں آیت اللہ خمینی کے

انقلاب کی حمایت کررہے ہیں لیکن وہاں تو انسانی حقوق کی بہت سی خلاف ورزیاں ہورہی ہیں۔ وہاں تو پریس کی آزادی کو روکا جارہا ہے۔ مارکسسٹ قتل کئے جارہے ہیں۔ ترقی پسندوں کو مارا جارہا ہے۔ ان کے خلاف مقدمات قائم کیے جارہے ہیں۔ تو فوکو نے اس کا جواب دیا کہ ان کا سچ وہ نہیں جو ہمارا سچ ہے۔ یہ بات بہت اہم ہے۔ یونانیوں کا ایک سچ تھا اور عربوں کا ایک اس سے علیحدہ سچ ہے۔ ایرانی جب بات کرتے ہیں تو ان کی ہر بات میں دو معنی ہوتے ہیں۔ اور اگر شخص ذو معنی جملہ بولے تو اسے بہت عمدہ خصوصیت مانا جاتا ہے۔ جب وہ کوئی ایسی بات بھی کررہے ہیں کہ آپ کو لگتا ہے کہ یہ بالکل سچ نہیں ہوسکتا تب بھی اس کا کوئی گہرا معنی ہے جو ہمیں سمجھ نہیں آ رہا۔ آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ یہ کتنی بونگی بات ہے۔

اس کے بعد ایک پوسٹ سٹرکچرلسٹ روس الیگاری نے یہ کہا کہ آئن سٹائن کی جو مساوات ہے mc2=e ہے یہ ایک صنفی مساوات ہے جو پدرسری نظام کو مضبوط کرتی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کے روشنی کی رفتار مسکولین ہے باقی فیمنن قسم کی رفتار ہیں۔ ان کو دکھایا نہیں جارہا۔ مزید کہتی ہیں کہ سولڈ مکینکس کو فلوئیڈ مکینکس پر زیادہ ترجیح دی گئی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ جیک لاکان کی بڑی تعریفیں کی جاتی ہیں۔ لیکن شاید تعریفیں کرنے والوں نے اسے پڑھا نہیں ہے۔ اس نے کوشش یہ کی کہ جتنی پوسٹ ماڈرنسٹ اور پوسٹ سٹرکچرلسٹ قسم کی باتیں تھیں ان سب کو ریاضیاتی مساوات میں ڈال دے۔ جن ریاضیاتی مساواتوں میں نیولبرلز وغیرہ لکھتے ہیں یہ بالکل احمقانہ قسم کی ریاضیاتی مساواتیں ہیں۔ مثال کے طور پر جیک لاکان نے مردانہ عضو کو سکوئر روٹ مائنس ون کے ساتھ مماثل قرار دیا گیا ہے۔

بار برا ایرن رائیک نے اس کا بڑا اچھا جواب دیا۔ انھوں نے لکھا کہ what is it matter if some french guy wants to think of his penus as the squire root of minus one. کس قسم کی عجیب وغریب مباحث ہورہے ہیں کہ مردانہ عضو کا سکوئر روٹ مائنس ون کے ساتھ موازنہ کیا جارہا ہے۔ نیویارک یونیورسٹی میں فزکس کے پروفیسر ایلن سوکال نے پوسٹ ماڈرنسٹ نظریئے کے انداز فکر کو ایکسپوز کرنے کے لئے ایک ریسرچ پیپر لکھا اور ایک انتہائی اہم پوسٹ ماڈرنسٹ جرنل میں اسے شائع کروانے کے لئے بھیجا۔ اس کے ادارتی بورڈ میں بڑے بڑے پوسٹ ماڈرنسٹ دانشور اور مصنفین شامل تھے۔ سوکال نے جان بوجھ کر ایک جعلی اور بونگا آرٹیکل لکھا تھا۔ اس کا مقصد محض پوسٹ ماڈرنسٹ سوچ کا بونگا پن ظاہر کرنا تھا۔ دلچسپ بات یہ کہ یہ آرٹیکل چھپ گیا۔ اس نے اپنے اس آرٹیکل میں لکھا کہ "میری ذات سے باہر ایک دنیا ہے" یہ سوچ ایک بہت بڑا ڈوگما Dogma ہے جو روشن خیالی Enlightenment نے پیدا کردیا ہے۔ میری ذات سے باہر جو مادی دنیا ہے اس کے کچھ اصول وقوانین ہیں۔ جو مجھ سے الگ اور خودمختار ہیں اور میری سوچ کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ روشن خیالی نے ہمیں یہ غلط طور پر سکھایا ہے کہ آپ کی ذات سے باہر کوئی دنیا ہے اور وہ دنیا قواعد وضوابط کو تسلیم کرتی ہے اور ہم سائنس کے اصولوں کو استعمال کرتے ہوئے ہم اس مادی دنیا کے اصول وقوانین کو سمجھ سکتے ہیں۔ کوئی سائنسدان ایسی احمقانہ بات نہیں کہتا۔

ڈِیوڈ ہیوم نے اس کا بڑا اچھا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ جو بھی یہ سمجھتا ہے کہ فزکس کے قوانین صرف میرے دماغ کے اندر ہیں اس کو میں دعوت دیتا ہوں کہ میرے ان تصورات کو میرے کمرے کی کھڑکی سے چھلانگ مار کر غلط ثابت کرے کہ میں اکیسویں منزل پر رہتا

ہوں۔

سوکال نے مزید لکھا کہ جیک لاکان کی فرائیڈین سپیکولیشن کو انٹم تھیوری نے ثابت کردی ہیں۔ یہ کہیں بھی ثابت نہیں ہوئیں۔ سوکال نے جان بوجھ کر اپنے آرٹیکل میں بونگی ماری تھی۔ پھر اس نے یہ کہا کہ ڈریڈا کے ویریبلٹی کے حوالے سے تصورات کو آئن سٹائن کے نظریہ اضافت کو درست ثابت کردیا ہے۔ حالانکہ ان دونوں کا نہ تو کوئی تعلق ہے اور نہ ایک نے دوسرے کو کچھ ثابت کیا ہے۔ جب اس حوالے سے پورے اخبارات میں چھپنا شروع ہوگیا اور بہت بڑا اسکینڈل بن گیا تو پوسٹ ماڈرنسٹ اس پر بہت زیادہ اپ سیٹ ہوئے۔ اس آرٹیکل کے چھپنے کے ایک مہینے بعد سوکال نے یہ بات پبلک کردی کہ یہ تو سارا جھوٹ تھا۔ اس کے بعد پوسٹ ماڈرنسٹ لوگوں میں اس کے خلاف لکھنا شروع کیا اور اس پر تنقید شروع کی۔ پوسٹ ماڈرنسٹ لوگوں نے لکھا کے اس طرح کی جعلسازی کر کے آپ نے خدا مت پسند آئی بازو کو مضبوط کردیا ہے اور بایاں بازو اس سے کمزور ہوا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اگرچہ اس وقت فیمنزم اور جنڈر سٹڈیز پر پوسٹ ماڈرنزم کے گہرے اثرات ہیں مگر وہ فیمنسٹ ہی تھیں جنہوں نے ان کا دفاع کیا۔

اس کے بعد ایک اور تنازع کھڑا ہوا۔ ڈی کنسٹرکشن ازم کے حوالے سے بڑے نام پال دی مان کے بارے میں یہ بات کھل کر سامنے آئی 1930ء کے عشرے میں ہیں وہ نازی جرنلز کے لئے مضامین لکھا کرتا تھا کے یہودیوں پر تشدد کیا جائے اور ان کو قتل کیا جائے۔ ان کے تمام خطوط لوگوں کے سامنے آگئے۔ پوسٹ ماڈرنزم، پوسٹ سٹرکچرلزم اور نازی ازم کے درمیان گہرا تعلق لوگوں کے سامنے آشکار ہوگیا۔ پوسٹ ماڈرن ازم کا حقیقی بانی تو ہائیڈگر ہے اور ہائیڈگر نازی تھا اور نازی پارٹی کے اہم دانشور نطشے کو اپنا استاد مانتے تھے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔ ہٹلر بھی یہ کہتا ہے کے نطشے ایک بہت بڑا دانشور ہے اور ہٹلر کے اردگرد موجود دانشور بھی نطشے کے پیروکار تھے۔ اس کو پڑھنے کے لئے باقاعدہ سٹڈی سرکلز منعقد کئے جاتے تھے۔ بعد میں نطشے کو وائٹ واش کیا گیا کہ نہیں نہیں وہ تو اس کی بہن کی غلطی تھی وغیرہ وغیرہ۔ اس پر اب بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ اس سے یہ تصور مزید مضبوط ہوگیا کہ پوسٹ ماڈرن ازم اور پوسٹ سٹرکچرل ازم اپنے تصورات بنیادی طور پر نازی ازم سے لیتا ہے اور یہ ایک ہی ہیں۔ یہ بائیں بازو کا نظریہ نہیں بلکہ یہ دائیں بازو کا نظریہ ہے۔

جب دیمان کا یہ سارا معاملہ سامنے آیا تو پھر یہ مزید واضح طور پر ثابت ہوگیا۔ اس پر پوسٹ ماڈرنسٹس نے کہا کہ نہیں نہیں وہ نازیوں کے اندر گھس کر ان کو تبدیل کررہا تھا۔ اس کے لیے ٹیکسٹ کے دو مطالب ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب فضول باتیں ہیں۔ دو مطالب کیا ہیں؟ جیک ڈریڈا اگر یہ کہتا ہے کہ Every thing is a text. تو پروفیسر رچرڈ ایون اس کا بڑا خوبصورت جواب دیتا ہے کہ گیس چیمبرز صرف لفاظی نہیں تھی لوگ حقیقی طور موت کا شکار بنائے گئے تھے۔ ہوسکتا ہے اکثر پوسٹ ماڈرنسٹ نازی ازم کے خلاف ہوں لیکن آپ کوئی بنیاد ہی نہیں چھوڑتے کہ آپ نازی ازم یا فاشزم کی مخالفت بھی کرسکیں۔ اسی طرح پروفیسر سٹینلے فشر بہت خوبصورت بات کہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ Post Modernism release me of the obligation to be right and demands me only that i be interesting. اور یہ فقرہ مکمل طور پر ژاں ژک کی شخصیت کے عین مطابق ہے۔ اس کی باتوں میں سیکڑوں تضادات ملتے ہیں لیکن اس کا انداز اتنا دلچسپ ہے کہ قطع نظر اس کے کہ وہ صحیح کہہ رہا ہے یا غلط کہہ رہا ہے بہت سارے

لوگ اس سے جا کر سنتے ہیں اور اس سے بہت متاثر بھی ہوتے۔

آخر میں آپ کو میں یہ مثال دیتا ہوں کہ فال فائیر ابن بینڈ اپنی کتاب Farewell to Reason میں لکھتے ہیں کہ صرف ان لوگوں کے لئے سائنس بہتر نتائج دیتی ہے جو پہلے سے سائنس کو قبول کرتے ہیں۔ باقی لوگوں کے لئے سائنس بہتر نتائج نہیں دیتی۔ آخری بات یہ کہ ایک بیماری پیدا ہوگئی ہے جس کا نام Non Judgementalism ہے۔ یعنی کہ میں یہ نہیں کہوں گا کہ آپ کا خیال غلط ہے۔ بس میں بھی ٹھیک ہوں، آپ بھی ٹھیک ہیں اور وہ بھی ٹھیک ہے۔ ہر بندہ ٹھیک ہے میں کہتا ہوں باہر دن ہے آپ کہتے ہیں کہ نہیں رات ہے، دونوں ٹھیک ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ دنیا چپٹی ہے میں کہتا ہوں کہ دنیا گول ہے۔ آپ بھی غلط نہیں ہیں، میں بھی صحیح کہہ رہا ہوں۔ مکمل متضاد باتوں حتی کہ انتہائی فضول باتوں کے بارے میں بھی یہ کلچر پیدا کر دیا گیا ہے کہ کوئی بھی بندہ کچھ بھی بات کہے آپ نے یہ نہیں کہنا کہ یہ بکواس ہے، یہ بہت بڑی بونگی ہے، یہ بات جھوٹ ہے، حقائق اس کو ثابت نہیں کرتے۔ پوسٹ ماڈرنزم کے حساب سے ہم اب ایسی دنیا میں رہتے ہیں جس سے پوسٹ فیکٹ ورلڈ کہتے ہیں۔ یعنی کہ اب حقائق ہیں ہی نہیں، اب صرف بیانیے ہیں۔ یہ حقیقت نہیں کہ تیمور رحمٰن 1975ء میں پیدا ہوا تھا یہ محض ایک بیانیہ ہے۔ یہ حقیقت نہیں ہے کہ لاہور پنجاب کے اندر ہے، پنجاب پاکستان کے اندر ہے، پاکستان جنوبی ایشیاء میں ہے۔ یہ سب بیانئے ہیں۔ ان کو ثابت کرنے کے لئے حقائق موجود نہیں ہیں۔

اگر غور کریں تو ڈونلڈ ٹرمپ جیسے لوگ پوسٹ فیکٹ ورلڈ کی ہی پیداوار ہیں او کے اب ہمیں یہ پروا نہیں ہے کہ وہ درست کہہ رہا ہے یا غلط کہہ رہا ہے۔ ہمیں بس یہ پروا ہے اس کا بیانیہ مجھے پسند آ رہا ہے یا نہیں۔ اگر مجھے وہ پسند آ رہا ہے تو ٹھیک ہے۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ اس کے پاس ثبوت موجود ہیں یا نہیں۔ اس Non Judgmentalism کا آخری نتیجہ "منطق کی موت" ہے۔ ہم نے منطقی سوچ کے لئے دروازے بند کر دیئے ہیں۔ ہم منطقی انداز میں سوچنے کے لئے تیار ہی نہیں۔ کیونکہ ہم کسی دوسرے کے بارے میں اس Politicaly Correct Culture میں یہ کہنے کے لئے تیار ہی نہیں نہیں تم ٹھیک نہیں کہہ رہے۔ یہ بات کرنے کو کوئی تیار نہیں کہ میرے پاس تمہارے نظریئے کو غلط ثابت کرنے کے لئے ثبوت اور دلائل موجود ہیں۔ کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ مساوات قائم کرنے کے لئے باہمی احترام ہونا چاہئے اور احترام کا تقاضا یہ ہے کہ خواہ کوئی کتنی بڑی ہی بونگی کیوں نہ مار رہا ہو ہمیں یہ نہیں کہنا چاہئے کہ یہ بات بونگی ہے۔ بلکہ ہمیں کہنا چاہیے کہ یہ بھی ایک اچھا نقطہ نظر ہے۔ اگرچہ یہ آپ کا نقطہ نظر ہے، میرا نقطہ نظر کچھ اور ہے۔ دونوں کا نقطہ نظر ٹھیک ہے۔ کوئی بھی نقطہ نظر غلط نہیں۔ آپ کی سوچ بھی اتنی ہی اہم ہے جتنا میری سوچ اہم ہے۔ کیونکہ درحقیقت کوئی سچائی تو ہے نہیں اور نہ ہی کوئی حقیقت ہے۔ ہر چیز ایک نقطہ نظر ہے، ایک متن Text ہے۔ یہ پوسٹ ماڈرنسٹ نظریہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی بنیاد پر بایاں بازو کبھی بھی ایک بہتر اور ترقی پسند سماج نہیں بنا سکے گا۔ نہ اس سے بایا بازو مضبوط ہوگا۔ عورتوں کی نجات کا مسئلہ ہو یا مزدوروں کی نجات کا مسئلہ ہو، اقلیتوں کا سوال ہو یا جبری مشقت کا سوال ہو، ان کو حل کرنے کے لئے ہمیں ایک سائنسی علم اور تحقیق کی ضرورت ہے۔ میرے بیانیے یا آپ کے بیانیے کے اچھا برا ہونے سے یا اس حوالے سے غیر جانب داری اختیار کرنے سے یہ مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ ان کے حل کے سائنس، منطق اور تحقیق کی ضرورت ہے۔

نیشنلزم۔1

نیشنلزم کا موضوع بہت حساس ہے۔آپ پوچھیں گے کہ نیشنلزم کب سے حساس ہوگیا؟اگر دیکھا جائے تو پوری دنیا کے اندر آپ کو نیشنلزم نظر آتا ہے۔ ہر ملک کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے وطن سے پیار کرتے ہیں۔ پھر اس میں تنازعہ کیا ہے؟ آج ہم کہہ سکتے ہیں کہ نیشنلزم ایک ایسا تصور ہے جو ہر جگہ موجود ہے۔جس طرح سے جمہوریت کا تصور موجود ہے،اسی طرح سے نیشنلزم موجود ہے۔جب لوگوں کو کوئی پولیٹیکل سائنٹسٹ یہ بتاتا ہے کہ نیشنلزم ہمیشہ سے موجود نہیں تھا تو لوگ یہ سن کر حیران اور پریشان ہوتے ہیں۔نیشنلزم کا تصور اٹھارویں صدی میں سامنے آیا۔اس کے بنیادی عناصر بھی اٹھارویں صدی میں ہی طے ہوئے تھے۔درحقیقت جب ہم تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانے میں ریاستیں بڑی بڑی سلطنتیں ہوتی تھیں۔وہ نیشنلزم کے نظریئے کو استعمال نہیں کرتے تھے کیونکہ اس میں کئی زبانوں کے لوگ رہا کرتے تھے۔مثال کے طور پر ہم سلطنت روم کی بات کرسکتے ہیں،بازنطینی سلطنت کی بات کرسکتے ہیں اور ایرانی سلطنت کی بات کرسکتے ہیں،اسلامی خلافت کی بات کرسکتے ہیں۔ان سلطنتوں کے اندر کئی زبانیں بولنے والے لوگ رہا کرتے تھے۔لہذا یہ نہ تو کسی ایک قوم کی نمائندگی کرتے تھے اور نہ اس طرح سے سوچتے تھے۔سلطنت روم برطانیہ سے لے کر مشرق وسطیٰ تک پھیلا ہوئی تھی۔سلطنت ایران ترکی سے لے کے شمالی ہندوستان تک پھیلی ہوئی۔اسی طرح سے خلافت کا ذکر کریں تو پورے شمالی افریقہ سے لے کر مشرق وسطیٰ سے آگے ہندوستان تک اس کی وسعت اور پھیلاؤ تھا۔یہ ایسی سلطنتیں تھیں جہاں لوگ کئی کئی زبانیں بولا کرتے تھے اور ایک قوم کے حوالے سے ان کی شناخت نہیں ہوا کرتی تھی۔یا تو مذہب کے حوالے سے ان کی شناخت ہوتی تھی یا پھر حکمران خاندان کے حوالے سے شناخت ہوتی تھی۔پھر اقوام Nations کیسے پیدا ہوئیں؟اس کا جواب یہ ہے کہ جب سرمایہ داری کا آغاز ہوا تو سب سے پہلے تجارت شروع ہوئی اور پہلی پہلی منڈیاں بنیں۔لوگوں نے ایک دوسرے کے ساتھ تجارت شروع کی۔ظاہری بات ہے کہ سب سے پہلے وہی لوگ ایک دوسرے کے ساتھ تجارت کرسکتے تھے جو ایک دوسرے کی زبان جانتے تھے۔جو ایک دوسرے کے قریب رہتے تھے۔جن کا آپس میں میل جول رہتا تھا۔فیوڈل نظام میں گاؤں ایک دوسرے سے بہت دور اور تنہا تھے۔وہ ایک دوسرے سے نہیں ملتے تھے نہ ایک دوسرے کے لئے پیداوار کرتے تھے۔وہ اپنی روزمرہ ضروریات اور اشیاء کی پیداوار کے حوالے سے خودمختار ہوا کرتے تھے۔بڑے بڑے مینرز یا فیس یا ہندوستان میں دیہی معاشرے اپنے اندر خودمختار ہوا کرتے تھے۔

جب سرمایہ دارانہ نظام پیدا ہونا شروع ہوا سب سے پہلی تبدیلی یہ ہوئی کہ انہوں نے محض اپنی کمیونٹی کے لئے پیداوار کی بجائے منڈی میں فروخت کرنے کے لیے پیدا کرنے کے لئے سوچا۔انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہم اپنے لیے یا محض اپنے خاندان کے لئے یا اپنے گاؤں کے لیے ہی اشیاء پیدا نہ کریں۔ بلکہ اشیاء کو زیادہ مقدار میں پیدا کر کے منڈی میں فروخت کر دیا جائے اور وہ اشیاء منڈی سے خرید لی جائیں جن کی ضرورت ہو۔

اس سے نئی کمیونیٹیز پیدا ہوئیں: ان کی خصوصیات یہ تھیں کہ: نمبر ایک وہ خانہ بدوش نہیں تھیں،اور نمبر دو وہ ایک ہی زبان ایک

دوسرے سے بولتی تھیں۔ظاہر ہے جب وہ ایک ہی زبان ایک دوسرے سے بول سکیں گے تو ہی ایک دوسرے سے پوچھ سکیں گے کہ آٹے کا بھاؤ کیا ہے؟ چیزوں کی قیمت کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔اگر کوئی مشترک زبان نہیں ہوگی تو ایک دوسرے سے تجارت کرنا بھی مشکل ہوگا۔تیسری بات یہ کہ وہ ایسی کمیونٹی تھی جو ایک ہی علاقے میں رہتی تھیں۔یہ انٹرنیٹ کا زمانہ تو نہیں تھا کہ آپ ایمازون پہ جا کر چیزیں آرڈر کر سکتے۔خود جا کر اشیاء خریدنا پڑتی تھیں۔جب وہ معاشی طور پر ایک دوسرے سے جڑ گئے تو ان کی ایک مشترکہ معیشت بھی بن گئی۔ چونکہ ان کا علاقہ مشترک تھا، زبان ایک تھی اور معیشت بھی ایک تھی، چنانچہ ان کا ایک مشترکہ کلچر بھی وجود میں آ گیا۔یہی وہ پانچ خصوصیات ہیں جن کی بنیاد پر قومیں وجود پذیر ہوئیں اور اصطلاح میں یہی کسی قوم کے بنیادی اجزاء قرار پائے۔ان کو میں دوبارہ بتا دیتا ہوں۔مستقل رہائشی کمیونٹی یعنی کہ خانہ بدوش نہ ہوں، مشترکہ زبان ہو، مشترکہ علاقہ ہو، مشترکہ کلچر ہو اور مشترکہ معیشت ہو۔یہ پانچ خصوصیات تھیں جن کی بناء پر ایسی کمیونٹیز بنیں جنہوں نے اپنے آپ کو قوم کہنا شروع کیا۔انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ہم انگلش ہیں ہم فرنچ ہیں۔

جیسے جیسے یہ کمیونٹیز امیر اور دولت مند ہوئیں اور ان میں سرمایہ دارانہ تبدیلیاں ہوئیں، انہوں نے ترقی کی تو انہوں نے جاگیرداروں کے خلاف، زمین کے مالکوں کے خلاف اور بڑی بادشاہتوں کے خلاف بغاوت کر دی۔جب یہ کمیونٹیز قائم ہوئیں اور ان کی بغاوتوں کے نتیجے میں نئے حکمران بنے تو انہوں نے سب سے پہلے قومی ریاستیں قائم کیں۔اس کی کلاسیکی مثال انگلینڈ ہے یا پھر انقلاب فرانس کے نتیجے میں فرانس میں قائم ہونے والی ریاست ہے۔انقلاب فرانس کے بعد فرانس سرمایہ دارانہ ارتقاء کی وجہ سے ایک قوم بنا۔جب فرانس میں انقلاب ہوا تو سب سے پہلے اردگرد کی ریاستوں نے اس پر حملہ کر دیا۔سب سے پہلے انہوں نے اپنا دفاع کیا اور دفاع کے بعد انہوں نے حملہ آور ریاستوں پر حملہ کر دیا اور بہت ساری ریاستوں کو فتح کر لیا۔نپولین بوناپارٹ نے جب یورپ پہ حملہ کیا۔تو یورپ کی بڑی بڑی سلطنتوں نے، جن میں کئی زبانوں کے بولنے والے لوگ رہتے تھے، سوچا کہ یہ فرانس تو بہت طاقتور ہو گیا ہے۔اس لئے ہم بھی وہ تبدیلیاں کریں جو تبدیلیاں انہوں نے کی ہیں۔خاص طور پر فوج کو جدید کریں اور فوج کو جدید کرنے کے لیے ایسی صنعت لگائیں جو ہتھیار بنا سکے تاکہ فرانسیسیوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔

چنانچہ انہوں نے صنعتیں قائم کرنا شروع کیں جس کے نتیجے میں سرمایہ داری نے اپنے قدم جمائے۔انگلینڈ اور فرانس میں سرمایہ داری نیچے سے پیدا ہوئی یعنی اوپر فیوڈل کلاس تھی نیچے سرمایہ داری پیدا ہوئی پھر اس نے فیوڈل کلاس کو نکال باہر کیا۔باقی یورپ میں اس کے بالکل الٹ ہوا۔باقی یورپ میں فیوڈل کلاس نے خود سوچا کہ فرانس اور انگلینڈ تو بہت آگے نکل گئے ہیں۔ہم بھی اپنے معاشروں مین ان جیسی تبدیلیاں کریں اور سرمایہ دارانہ نظام قائم کریں۔یورپ میں فیوڈل طبقے نے خود سرمایہ دارانہ نظام کو ترویج دی اور یوں سرمایہ داری اوپر سے نیچے تک آئی۔انگلینڈ اور فرانس میں سرمایہ دارانہ نظام نیچے سے اوپر تک پھیلا اور جرمنی اور دوسرے یورپ میں اوپر سے نیچے آیا۔جہاں پر سرمایہ داری اوپر سے نیچے آئی یہ وہ جاگیردار ریاستیں تھیں جو بہت بڑی بڑی تھیں۔وہاں مختلف زبانیں بولنے والے لوگ رہتے تھے اور وہاں ابھی قوم وجود میں نہیں آئی تھی۔جرمن قوم ابھی نہیں بنی تھی، پروشین قوم کا بھی ابھی کوئی وجود نہیں تھا اور یہاں پہلے ہی سرمایہ داری کا ارتقاء شروع ہو گیا۔یہاں جو ریاستیں وجود میں آئیں وہ کثیر القومی ریاستیں تھیں۔ان کے اندر ایک قوم نہیں تھی بلکہ وہاں کئی

قومیں تھیں۔ جیسے جیسے سرمایہ داری پھیلی ان قوموں نے اپنی شناخت قائم کرنا شروع کر دی اور اپنا سیاسی اظہار شروع کیا۔

سرمایہ داری نظام کے کچھ معاشی اصول ہیں جن سے بچا نہیں جا سکتا۔ وہ یہ کہ اس نظام کے تحت ناہموار ترقی ہوتی ہے۔ جو کسی وجہ سے تھوڑا سا بھی امیر ہو جائے وہ پھر امیر ہوتا چلا جاتا ہے اور بحیثیت مجموعی غریب مزید غریب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے چند لوگ ہیں جو غریب ہوتے ہوئے بھی امیر ہو جاتے ہیں اور بعض امیر بھی غریب ہو جاتے ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی امیر اور غریب کے درمیان فرق بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جیسے جیسے امیر اور غریب طبقات کے درمیان فرق بڑھتا چلا جاتا ہے ویسے ویسے غریب اور امیر قوموں اور ریاستوں کے درمیان فرق بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جو قومیں سرمایہ دارانہ نظام کا ارتقاء کر لیں اور تھوڑا سا سرمایہ دارانہ نظام میں آگے قدم رکھ لیں وہ پھر آگے نکلتی چلی جاتی ہیں۔ اور پھر وہ ان لوگوں کا، ان ریاستوں کا اور ان اقوام کا استحصال کرتی ہیں جو پسماندہ رہ جاتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ کلونیل سسٹم قائم ہوا۔ نو آبادیاتی نظام سرمایہ دار ریاستوں نے قائم کیا۔ یہ انہوں نے اس وجہ سے قائم کیا کہ وہ تیسری دنیا کی قوت محنت کا استحصال کر سکیں۔ ان کا خام مال استحصالی انداز میں استعمال کر سکیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سرمایہ داری کے قیام کے بعد افراد اور قوموں کے درمیان تصادم بڑھتا چلا جاتا ہے یہ کم نہیں ہوتا۔ سرمایہ دارانہ ترقی قوموں کے درمیان تفاوت کو بڑھاتی چلی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی اقوام ہم سے کتنی زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ سائنس و ٹیکنالوجی ہو، کلچر اور آرٹ ہو وہ ہم سے بہت زیادہ ترقی یافتہ ہیں اگرچہ مجھے اس بات پر افسوس ہوتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہم ترقی یافتہ نہیں ہیں۔ اور یہ فرق بڑھتا چلا جا رہا ہے یہ کم نہیں ہو رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوتا ہے کہ جو قومیں آگے بڑھ جاتی ہیں پھر وہ کہتی ہیں کہ ہم دوسروں کو اپنے جمہوری نظام، ریاست اور اپنی ترقی میں کیوں حصہ دیں اگر ہم نے حصہ دیا تو وہ ضرور کوشش کریں گی کہ اس نابرابری کو برابری میں تبدیل کر لیں۔ یہ چونکہ قابل قبول نہیں ہوتا اس لئے فیصلہ کیا جاتا ہے کہ حصہ نہ دیا جائے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جو پرانی ریاستیں تھیں جن میں مختلف زبانیں بولنے والے لوگ تھے۔ ان کی بھی کچھ ایسی پالیسیاں ہوا کرتی تھیں کہ ایک قوم کے لوگ دوسری قوم کے لوگوں کو دباتے تھے۔ حتیٰ کہ سرمایہ دارانہ نظام کے ارتقاء کے بعد بھی یہ پالیسیاں جاری رہیں۔

ایک جانب تو سرمایہ دارانہ نظام کی اپنی غیر مساوی ترقی کے نتیجے میں اور دوسری جانب اس پالیسی کے نتیجے میں کہ امیر قوم اپنا سرمایہ غریب قوم کے ساتھ نہیں بانٹنا چاہتی، ریاست وہ پالیسی بنا لیتی ہے جسے ہم قوموں پر جبر کی پالیسی کہتے ہیں۔ جب قومی جبر اور استحصال کی پالیسی قائم ہو جاتی ہے اور جب قوموں کے درمیان فرق واضح طور پر قائم ہو جاتا ہے تو ظاہری بات ہے ان کے درمیان کشیدگی پیدا ہوتی ہے۔ جس کے نتیجے میں نیشنلزم یا قوم پرستی پیدا ہوتی ہے اس کا ارتقاء ہونے لگتا ہے۔ لیکن نیشنلزم اور بائیں بازو کی سوچ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ قوم پرست لوگوں کو اس بنیاد پر اکٹھا کرتے ہیں کہ وہ ایک زبان بولتے ہیں، ایک علاقے میں رہتے ہیں مگر سوشلزم والے ہمیشہ کہتے ہیں کہ جو مظلوم لوگ ہیں، غریب لوگ ہیں، جن پر جبر ہو رہا ہے، خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں، خواہ وہ کوئی بھی زبان بولتے ہیں، ان سب کو اکٹھا ہونا ہے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ طبقاتی شعور غریب لوگوں کو سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے خلاف اکٹھا کرتا ہے۔ جبکہ نیشنلزم لوگوں کو اس طرح سے منظّم کرتا ہے کہ جو لوگ ایک زبان بولتے ہیں یا ایک علاقے میں رہتے ہیں، وہ

سب ایک دوسرے کا ساتھ دیں۔مثال کے طور پر فرانسیسی سرمایہ دار اپنے محنت کشوں کو یہ کہیں گے کہ میں بھی فرانسیسی ہوں اور آپ بھی فرانسیسی ہیں ہم دونوں ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔آپ کیوں برطانوی مزدوروں کی ہڑتال کی حمایت کر رہے ہیں۔برطانوی سرمایہ دار بھی یہی کہے گا اور جرمن سرمایہ دار بھی یہی کہے گا۔سرمایہ دار طبقہ ہمیشہ مزدوروں کو یہ سبق سکھانا چاہتا ہے کہ آپ اپنے ہی حکمران طبقے کا ساتھ دیں ناں کہ دوسرے محکوم طبقوں کا جو آپ کی زبان نہیں بولتے۔ظاہر ہے چونکہ ورکرز ایک دوسرے کی زبان نہیں بولتے اس لیے اکثر ان کے درمیان غلط فہمیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں اور بہت سے ورکرز کہتے ہیں کہ ہاں میں اپنے قوم کے سرمایہ داروں کا ساتھ دوں گا۔میں کیوں انگریز کارکنوں کے ساتھ یا کسی دوسری زبان بولنے والوں کے ساتھ یونین بناؤں یا ان سے ہمدردی کروں۔کارل مارکس نے جب اپنا فلسفہ پیش کیا اور لوگوں کو یہ سمجھایا کہ پوری دنیا کے محنت کشوں کو اکٹھا ہونا ہوگا۔لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ کیا بات ہوئی آپ تو قوموں کو ہی نہیں مانتے،آپ تو ملکوں کو ہی نہیں مانتے،آپ ملکوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں،آپ قوموں کو ختم کرنا چاہتے تو مارکس یہ جواب دیتا ہے کہ کمیونسٹوں پر یہ الزام لگتا ہے کہ وہ ملکوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں،وہ قوموں کو نہیں مانتے،لیکن دراصل مزدور کا کوئی وطن نہیں ہوتا۔آپ کسی سے وہ چیز کس طرح چھین سکتے ہیں جو ان کے پاس ہے ہی نہیں۔اس پر بہت ساری بحث ابھی ہونا ہے۔اول تو آپ یہ سوال اٹھائیں گے کہ جو قومیت کا تصور ہے یا قوم پرستی ہے وہ زبان،علاقے اور کلچر پر بنیاد رکھتی ہے۔پھر جو پاکستان یہ کہتا ہے کہ انڈیا کے مسلمان ایک قوم ہیں اس حوالے سے آپ کیا کہتے ہیں؟ پھر پاکستان کے اپنے حوالے سے بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ اسے ایک قوم کی ریاست سمجھتے ہیں یا کثیر القومی ریاست سمجھتے ہیں؟ اسے ایک قومی ریاست بننا چاہیے یا کثیر القومی ریاست بننا چاہیے؟ اور پاکستان کے اندر جو بلوچ، سندھی اور پشتون لوگ رہتے ہیں،ان کے درمیان کیسے تعلقات اور رشتے قائم ہونا چاہئیں؟ اور ان رشتوں کو ہمیں کیسے سمجھنا چاہیے اور ان مسائل کو کیسے حل کرنا چاہیے؟ یہ بحث اگلے لیکچر کا موضوع ہے۔

نیشنلزم۔2

گزشتہ لیکچر میں بتایا گیا تھا کہ قوم کی تعریف کیا ہے؟ میں نے یہ بتایا کہ سرمایہ داری کے آغاز میں مختلف گاؤں کے لوگوں کی آپس میں تجارت شروع ہوئی جس کی وجہ سے وہ ایک نئی کمیونٹی میں تبدیل ہوگئے۔ان کے مشترکہ زبان تھی مشترک زمین تھی اور مشترکہ معیشت تھی اوران کا ایک مشترک کلچر بھی تھا۔اس کی وجہ سے انہوں نے اپنے آپ کو ایک کمیونٹی تصور کرنا شروع کیا۔انہوں نے کوشش کی کہ ریاست پر قبضہ کرلیا جائے۔انہوں نے اس زمانے کے بڑے بڑے جاگیرداروں کو ریاست کے اقتدار سے ہٹایا اور بادشاہت کو ختم کر کے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ نئے مقتدر طبقے نے قومیتوں پر مبنی ریاستیں قائم کیں اس کی سب سے بڑی مثال برطانیہ اور فرانس کی دی جاسکتی ہے۔ان دونوں ممالک کی مثال ایسی ہے کہ ایک ریاست میں ایک ہی قوم بستی تھی۔لیکن یورپ میں دوسری ریاستیں کثیر القومی ریاستیں تھیں۔اس کی وجہ یہ تھی کہ ان ریاستوں نے خود سرمایہ دارانہ نظام کو متعارف کروایا۔مطلب یہ ہے کہ نظام نیچے سے اوپر کو نہیں گیا تھا مطلب یہ کہ نئے پیدا ہونے والے سرمایہ دار طبقے نے ریاست کے اقتدار پر قبضہ کر کے جاگیرداروں اور بادشاہوں سے اقتدار چھینا تھا بلکہ اوپر سے نیچے کو آیا تھا یعنی جاگیردار حکمرانوں نے خود سرمایہ داری قائم کی تھی۔ ہندوستان کی مثال بھی ایسی ہی ہے کہ یہاں برطانیہ کی حکومت بنی انہوں نے یہاں ایسی اصلاحات کیں جو یا رسرمایہ داری کی وجہ بنی۔

جیسے جیسے سرمایہ دارانہ نظام قومی ریاستوں کے اندر یا کثیر القومی ریاستوں کے اندر پھیلنا شروع ہوا تو ان ریاستوں کے درمیان آپس میں لڑائی بھی شروع ہوگئی۔ان کی لڑائی اس بات پر تھی کہ جو منڈیاں بن رہی ہیں اور جو زمین اور دیگر وسائل ہیں ان پر کس کا قبضہ ہوگا اور کون ان کا مالک ہوگا۔ ان کو کون استعمال کرے گا۔اس لڑائی کے نتیجے میں بہت سی قومی تحریک ابھری اور انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے لڑائی کی۔اگر ہم گزشتہ صدی کی طرف دیکھیں تو اس میں اکثر و بیشتر جنگیں اسی بنیاد پر ہوئیں کہ کونسی قوم کے افراد منڈی پر اور زمین پر کنٹرول کریں گے۔اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرلینا چاہیے کہ بنیادی طور پر قومی تحریک کا بنیادی مقصد یہی ہوتا ہے کہ منڈی پر قبضہ کیا جائے کوئی اور بندہ یا کسی اور قوم کے لوگ اس پر قابض نہ ہوں۔یعنی نیشنلزم کو طبقاتی اعتبار سے ایک بورژوا تحریک کہا جاسکتا ہے۔سرمایہ داری نظام سے اور سرمایہ داری نظام کے تقسیم کار سے اس کا تعلق ہے۔مگر جس قوم کی جس قدر سرمایہ دارانہ ترقی ہوتی ہے اسی حساب سے اس کی قومی تحریک کا کردار بھی قائم ہوتا ہے۔مثال کے طور پر سرمایہ دارانہ نظام بہت زیادہ ترقی کر چکا ہو تو اس کی بنیاد پر ایک قومی سرمایہ داری قائم ہوجاتی ہے۔اگر اس سے کم ترقی ہو تو شہری چھوٹا سرمایہ دار نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔اس سے بھی کم ترقی ہو تو ایک دیہاتی سرمایہ داری اور سرمایہ دار طبقہ اپنا بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔

یعنی ہمیں دیگر دنیا اور پاکستان میں جو مختلف قومی تحریکیں نظر آتی ہیں۔ان کے کردار کا انحصار اس بات پر ہے کہ سرمایہ داری نظام کس قدر ان قوموں میں ارتقاء پذیر ہو چکا ہے۔اس کی پاکستان کے حوالے سے کچھ مثالیں دی جاسکتی ہیں۔عوامی نشنل پارٹی کا آغاز جب باچا خان نے آغاز کیا تو شروع میں وہ ایک دیہاتی تحریک تھی۔لیکن اگر آپ موجودہ عوامی نیشنل پارٹی پر نظر ڈالیں تو اس میں پشتونوں کے

بڑے بڑے سرمایہ دار شامل ہیں۔آپ کہ سکتے ہیں کہ یہ ایک پختون قومی سرمایہ داروں کی تحریک ہے۔چھوٹے شہری سرمایہ دار طبقے کی تحریک اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کی سب سے بہترین مثال میرے خیال میں ایم کیو ایم ہے۔مہاجروں کے پاس علیحدہ کوئی زمین نہیں ہے وہ ان دو شہروں میں رہتے ہیں جہاں دیگر اقوام کے لوگ بھی آباد ہیں۔وہ ایک لسانی گروپ ہیں ان کو ایک قوم نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن بہر حال یہ تو ایک حقیقت ہے کہ ایم کیو ایم ایک شہری مڈل کلاس تحریک ہے۔اگر آپ دیہاتی،قبائلی سرداروں اور جاگیرداروں کی تحریک دیکھنا چاہتے ہیں جو قوم پرستی کی طرف جاتی ہے تو سندھ،بلوچستان اور کشمیر میں آپ کو بہت سی ایسی تحریکیں ملیں گی جو بنیادی طور پر کسانوں اور کسان طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔جو تحریکیں کسانوں سے تعلق رکھتی ہیں ان کے کردار میں زمین کا مسئلہ بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔مثال کے طور پر فلسطین کے اندر صیہونی یہ چاہتے تھے کہ یہودیوں کو کوئی ایسی جگہ ملے جہاں وہ اپنی آبادیاں بنا سکیں۔بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ ان کو زمین چاہیے تھی۔انہوں نے جب فلسطینیوں سے زمین چھینی تو فلسطینی پی ایل او جو ایک قومی تحریک تھی میں شامل ہو گئے۔جہاں زمین پر قبضے کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہو وہاں کسان قومی تحریک کا حصہ بن جاتے ہیں۔اس سلسلہ میں آئرلینڈ کے مثال بھی دی جا سکتی ہے۔بحیثیت مجموعی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قومی تحریک کا بنیادی کردار اس بات پر منحصر ہے کہ وہ کس قسم کی پابندیاں دوسری قوموں کے لوگوں پر لگاتے ہیں۔جو قوم سرمایہ دارانہ نظام میں کچھ حد تک ترقی کر جاتی ہے وہ اپنی سرمایہ کاری پوری دنیا کے اندر پھیلانا چاہتی ہے۔ان ملکوں کے اندر بھی پھیلانا چاہتی ہے جہاں سرمایہ داری پوری طرح ارتقاء پذیر نہیں ہوئی ہوتی۔تو یہ سرمایہ دار ان ملکوں میں موجود لوگوں کا استحصال بھی کرتے ہیں۔اس کے نتیجے میں حاکم اور محکوم قوموں کے درمیان لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔

حاکم قوم کچھ ظالمانہ اور جابرانہ پالیسیاں بھی نافذ کرے گی۔ جب لڑائی شروع ہو گی تو حاکم قوم یہ کوشش کرے گی کہ محکوم قوم کے لوگ آگے نہ آئیں۔محکوم قوم کے ملکیتی طبقے کی کوشش یہ ہو گی کہ وسائل پر سب سے پہلے ان کا کنٹرول ہو۔جس طرح بلوچستان میں بہت سارے قوم پرست یہ کہتے ہیں کہ آپ ہمارے علاقے سے سوئی گیس نکالتے ہیں لیکن ہمیں اس میں سے کچھ بھی نہیں ملتا۔جس قسم کی پابندیاں ہو گی اس قسم کی قومی تحریک قائم ہو گی۔کہیں پر آنے جانے کے حوالے سے پابندیاں ہوں گی تو قومی تحریک اسی بنیاد پر ہو گی۔کہیں پر زبان کا مسئلہ بہت اہمیت اختیار کر جاتا ہے حاکم قوم محکوم قوم کی زبان کو دبا دیتی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ آپ نے صرف ہماری زبان بولنی ہے۔جس طرح زار کے زمانے کے روس میں کہا جاتا تھا کہ آپ نے صرف روسی زبان بولنی ہے۔وہی سرکاری زبان ہو گی اور باقی کسی زبان کی کوئی اہمیت نہیں ہو گی۔مشرقی پاکستان میں بنگالیوں کے ساتھ بھی اس وقت جھگڑا شروع ہوا جب اردو کو قومی زبان قرار دیا گیا۔ بنگالیوں نے کہا کہ ہماری زبان کو بھی قومی اور سرکاری زبان قرار دیا جائے اور ہماری زبان کو بھی اردو زبان کے برابر تسلیم کیا جائے۔اسی چیز پر وہاں سب سے پہلے جھگڑا شروع ہوا۔ایسے بھی ہوتا ہے کہ حاکم قوم کے لوگ محکوم اقوام کے سکول بھی بند کروا دیتے ہیں۔اس سے محکوم قوم کا ذہنی ارتقاء رک جاتا ہے۔کیونکہ لوگ اپنی زبان میں سوچتے ہیں اگر کسی قوم کی زبان پر پابندی لگا دی جائے اور ان کے اسکولوں کو بند کر دیا جائے تو اس کے نتیجے میں اس قوم کا نظریاتی اور دانشورانہ ارتقاء رک جائے گا۔اسی کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ نمائندگی کے حوالے سے بہت لڑائی جھگڑا رہتا ہے۔کہ ہمیں حکومت میں شامل کیا جائے،ہمیں فوج میں شامل کیا جائے یا افسر شاہی نظام میں شامل کیا جائے۔بعض

علاقوں میں مذہب کے حوالے سے پابندیاں لگادی جاتی ہیں۔مثلا اگر کوئی سنی ریاست ہوتو وہ نوروز کے حوالے سے کہیں گے کہ اس روز چھٹی نہیں ملے گی یا اس تہوار کو نہ منائیں وغیرہ وغیرہ۔اس قسم کی مذہبی پابندیوں سے بھی لڑائی جھگڑا شروع ہوسکتا ہے۔جس قسم کی پابندیاں ہوں گی قومی تحریک کا کردار بھی اسی قسم کا ہوگا۔اگر بنیادی مسئلہ زمین ہوگا تو اس کا کردار زرعی ہوگا جیسا کہ پہلے فلسطین کی مثال دی گئی اور آئرلینڈ کا حوالہ گیا۔کہیں مسئلہ زبان کا ہوگا جیسے سندھی، بلوچ یا پشتون لوگ کہتے ہیں کہ ہماری زبانوں کو بھی برابر کی اہمیت دی جائے۔حتی کہ پنجاب کے اندر بھی لوگ کہتے ہیں کہ پنجابی کو بھی اردو کے مقابلے میں برابری کی نظر سے دیکھا جائے۔اسی طرح سے شہری برابری اور شہری حقوق کا مسئلہ بھی کھڑا ہوسکتا ہے۔مذہبی آزادی کا مسئلہ بھی پیدا ہوسکتا ہے۔ پارلیمنٹ میں نمائندگی کا مسئلہ بھی ہوسکتا ہے۔اسی طرح صوبائی خودمختاری کا مسئلہ بھی جھگڑے کا باعث بن سکتا ہے۔

اب اس بات پر توجہ دیتے ہیں کہ قومی مسئلے کا ممکنہ حل کیا ہوسکتا ہے؟ دنیا کے اندر بہت سارے مسائل ہیں۔میرے لیکچرز کا مقصد ان کا حل تلاش کرنا ہے۔جو ملکیتی طبقے ہیں اور جن کی لڑائی ملکیت کی بنیاد پر ہے تو وہ قوموں کی لڑائی کو یا قومیتوں کی بنیاد پر لڑائی کو کمزور نہیں کریں گے بلکہ وہ تیز کریں گے۔سو پر سرمایہ دار طبقوں کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ کو سرمایہ کاری کر کے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کے قابل ہوجائے۔وہ دوسرے سرمایہ دار کے ساتھ ہمیشہ مقابلے میں رہتا ہے۔سرمایہ دار طبقے کا مقصد ہی اپنی ذاتی ملکیت اور کاروبار کو فروغ دینا ہے۔وہ قوموں کے درمیان لڑائی کو ختم نہیں کرسکتے بلکہ وہ ان کے درمیان کشیدگی کو اور تیز کرتے ہیں۔کیونکہ ان کا مفاد اس تنازع میں پوشیدہ ہوتا ہے۔حاکم قوم کے لوگ جرمنی کے نازیوں یا فاشسٹوں کی طرح یہ کہیں گے کہ ہم سب سے بہترین قوم ہیں اور باقی سب بیوقوف ہیں۔ہمیں اقتدار میں رہنا چاہیے۔محکوم قوم کے لوگ یہ کہیں گے کہ ہمیں اقتدار ملنا چاہیے۔ہم برابر کے حقوق کیوں حاصل نہیں کرسکتے۔اس طرح یہ لڑائی چلتی رہے گی۔

سوشلسٹوں کا مقصد ان سے مختلف ہوتا ہے۔وہ چاہتے ہیں کہ یہ ملکیتی نظام ہی مکمل طور پر ختم ہوجائے اور سرمایہ داری نظام کے نتیجے میں منڈی پر قبضے کے لئے جو لڑائیاں ہوتی ہیں اور زمینوں کی ملکیت اور معاشی وسائل پر کنٹرول کے لئے جو تنازعات کھڑے ہوتے ہیں وہ سرے سے ختم ہوجائیں۔قومی لڑائیوں بلکہ دنیا کے اندر ساری بڑی بڑی جنگوں کی اصل جڑ معاشی وسائل پر قبضے کی خواہش ہے۔اگر ہم سرمایہ داری نظام کو ختم کردیں تو انسان کا انسان کے ہاتھوں اور اقوام کا دوسری قوموں کے ہاتھوں استحصال ختم ہوجائے گا۔تب ہی کے لوگوں کے درمیان اور قوموں کے درمیان وسائل پر قبضے کا جھگڑا ختم ہوگا۔سوشلسٹ ہر قسم کے قومی جبر کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھتے ہیں۔اس جدوجہد کو جاری رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ سوشلسٹ چاہتے ہیں کہ ساری دنیا کے محنت کش اکٹھے ہوجائیں اور سرمایہ داری نظام کو ختم کردیں۔پاکستان تو ایک ملک ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ تمام دنیا کے محکوم و مظلوم اور غریب لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ایک اتحاد قائم کریں اور سرمایہ داری نظام کو ختم کریں۔لہذا ان کی کوشش یہ ہے کہ دنیا کی غریب اقوام اور محنت کش افراد کا ایک کثیر القومی اتحاد قائم ہوجائے۔اس کثیر القومی اتحاد کو قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ قومی جبر کی پالیسی کے خلاف جدوجہد کی جائے۔جب تک قومی جبر کی پالیسی کے خلاف جدوجہد نہیں ہوگی اور جب تک محکوم قوم کے محنت کشوں کو یہ نظر نہ آئے کہ قومی جبر کی پالیسی کا سوشلسٹ ڈٹ کر مقابلہ کررہے ہیں تو

کس طرح ممکن ہے کہ محکوم قوم کے محنت کش حاکم قوم کے محنت کشوں کے ساتھ اتحاد بنائیں۔

لہذا اس وجہ سے ہم سمجھتے ہیں کہ تمام قوموں کے مکمل طور پر برابر حقوق ہونے چاہئیں۔ان میں معاشی، سیاسی، ثقافتی اور سماجی تمام حقوق شامل ہیں۔دوسرے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ سچے معنوں میں ایک وفاقی ریاست قائم ہو جسے ہم ''فیڈرل اسٹیٹ'' کہتے جس میں ہر قوم کے لوگ رضا کارانہ طور پر شامل ہوں۔ایسا جبر کی وجہ سے نہ ہو اور نہ ہی ان کو ریاست میں زبردستی شامل کرنے یا رکھنے کے لئے ان پر بندوق کی نالی تانی جائے۔رضا کارانہ آزاد مرضی کے ساتھ کسی ریاست میں شمولیت یا عدم شمولیت ہر قوم کا حق ہے۔یہ صرف پاکستان کی بات نہیں ہے، سوشلسٹ پوری دنیا کی بات کرتے ہیں کہ اگر جبر کی بنیاد پر کسی قوم کو کسی ریاست میں شامل کیا گیا ہے تو اس کو وہ درست تسلیم نہیں کر سکتے بلکہ اسے غلط کہتے ہیں۔شمولیت ہمیشہ رضا کارانہ معاہدے کی بنیاد پر ہونا چاہئے۔اس میں کسی مرحلے پر بھی جبر شامل نہیں ہونا چاہئے۔لہذا اگر دنیا کسی بھی قوم کی اکثریت کسی ریاست میں نہ رہنا چاہے تو پھر اس کو یہ حق ہے کہ وہ علیحدہ ہو جائے۔اگر وہ اپنی علیحدہ ریاست قائم کرنا چاہے تو کر لے۔ہم کشمیر میں مطالبہ کرتے ہیں کہ اگر کشمیری بھارت میں نہیں رہنا چاہتے تو انہیں جبر کے ذریعے ہندوستان میں نہیں رکھا جا سکتا۔ سچی بات یہ ہے کہ پاکستان ہو، ہندوستان ہو، ایران ہو، کوئی ملک بھی ہو، سوویت یونین ہو، روس ہو، امریکہ ہو ہر ملک کے اندر یہ اصول لاگو ہونا چاہیے کہ کسی بھی قوم کے لوگوں کو جبری طور پر کسی ریاست کا حصہ نہ بنایا جائے۔اگر وہ رضا کارانہ طور پر کسی ریاست کے اندر رہنا چاہیں تو ٹھیک ہے۔اگر بلوچ رضا کارانہ طور پر پاکستان میں شامل ہونا چاہیں تو ٹھیک ہے۔اگر ان کی اکثریت پاکستان میں شامل نہ ہونا چاہے تو پھر بندوق کی نالی پر ان کو پاکستان میں رکھنا کبھی بھی اچھی پالیسی نہیں ہو سکتی۔اس کا نتیجہ ہمیشہ ہی برا اور مزید کشیدگی کی صورت میں نکلے گا۔جب ہم ایک سوشلسٹ ریاست میں وفاقی حکومت کی بات کرتے ہیں تو اس میں ہم یہ کہنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں کہ چار بنیادی چیزوں میں وفاقی ریاست کا کنٹرول ہو باقی تمام چیزوں کا اختیار صوبوں کو منتقل کر دیا جائے۔یہ چار چیزیں کیا ہیں؟ ان میں دفاع اور سکیورٹی، بین الاقوامی تعلقات اور آرمڈ فورسز پر کنٹرول وفاق کے کنٹرول میں رہنا چاہئے۔دوسرے نمبر پر وفاق میں شامل ہونے والے علاقوں میں بنیادی چیزوں پر قانون ملک کا وفاق قائم کرے۔ان میں سرحدوں کا مسئلہ ہے، انصاف کا نظام ہے، لیبر قوانین ہیں، سٹیزن شپ ہے اور ایمینسٹی وغیرہ ہیں۔

نمبر تین یہ کہ معاشی اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ بیرونی تجارت وفاقی حکومت کے کنٹرول میں ہو۔معاشی وسائل کے استعمال کے بنیادی اصول وفاق طے کرے۔قومی معاشی منصوبہ بندی بھی وفاق کرے۔قومی معاشی اعداد و شمار بھی وفاق اکٹھا کرے۔بینک پالیسی بھی وفاق کے کنٹرول میں ہونی چاہئے۔زری اور تجارتی پالیسی کے علاوہ اسٹیٹ انشورنس جیسی بنیادی پالیسی کی چیزیں جو معاشی منصوبہ بندی کا حصہ ہیں ایک سوشلسٹ ریاست میں وفاق کے کنٹرول میں ہوتی ہیں۔آخر میں یہ کہ بنیادی سوشل سروسز جن میں تعلیم، صحت عامہ، ٹرانسپورٹ اور مواصلات وغیرہ وفاقی حکومت مہیا کرے۔باقی تمام چیزیں صوبوں کو منتقل کر دی جائیں۔

ہر صوبہ، ہر ریاست، ہر ریپبلک، ہر قوم کو یہ حق ہونا چاہئے کہ اس کی زمین پر جو وسائل پیدا ہو رہے ہیں وہ سب سے پہلے ان کو اپنے لوگوں کے لیے استعمال کر سکے۔مزید برآں ہم تو یہ بھی کہتے ہیں کہ جہاں جہاں کسی قوم کے وسائل کا دوسروں نے فائدہ اٹھایا ہے

وہاں اضافی سرمایہ کاری کی جائے تا کہ دونوں قومیں برابر کی معاشی سطح پر آ جائیں۔ کسی بھی قوم کی حدود ان کی اجازت کے بغیر اور رضا کارانہ مرضی کے بغیر تبدیل نہ کی جائیں۔ اور آخر میں یہ کہ تمام زبانوں کو برابر کا درجہ دیا جائے۔ کسی زبان کو دوسری زبان پر فوقیت نہ دی جائے۔ جب ہم کسی ایک زبان کو دوسری پر فوقیت دیتے ہیں تو ہم اس زبان کے بولنے والوں کو دوسرے لوگوں پر فوقیت دے رہے ہوتے ہیں اور یہ ہم نہیں چاہتے۔

بنیادی بات یہی ہے کہ ہم قوموں کے درمیان جھگڑے کا سوشلسٹ حل چاہتے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ لوگ اکٹھے رہے ہیں۔ پاکستان تو پھر ایک ریاست ہے ہم تو دنیا بھر کے محنت کشوں کو اکٹھا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم تو یہی چاہتے ہیں کہ پاکستان میں رہنے والے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر بھائی چارے کے ساتھ رہیں۔ مگر اس بھائی چارے میں رہنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ قومی جبر کی پالیسی کا مقابلہ کیا جائے اور ایک ایسی ریاست کی بنیاد ڈالی جائے کہ جس کے اندر تمام گروپ، تمام قومیں اور تمام مذہب کے لوگ برابر کے شہری ہوں۔ معاشی اعتبار سے بھی برابر ہوں، سیاسی اعتبار سے بھی برابر ہوں، ثقافتی اعتبار سے بھی برابر ہوں اور سماجی اعتبار سے بھی برابر ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہم ان تمام قوموں کے لوگوں کو اس قسم کی برابری دے سکیں اور اس قسم کے حقوق دے سکیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ لوگ رضا کارانہ طور پر ایک دوسرے کے ساتھ نہ رہنا چاہیں۔ وہ بالکل رہنا چاہیں گے۔ ہم سوشلسٹ طریقے سے اس قومی سوال کو برابری اور جمہوریت کی بنیاد پر حل کر سکتے ہیں۔

نیشنلزم۔3

گزشتہ دو لیکچرز میں قوم پرستی کے حوالے سے جو بات کی گئی ہے پہلے اس کا یہاں خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ مارکسی لٹریچر میں قوم کی تشکیل کے لئے زبان، علاقہ، کلچر اور معیشت بنیادی عناصر قرار دیئے جاتے ہیں۔ نیشنلزم کے حوالے سے گزشتہ لیکچرز میں یہ بھی بتایا گیا کہ انگلینڈ اور فرانس میں کس طرح سے قومی ریاستیں وجود میں آئیں اور باقی یورپ میں کس طرح کثیر القومی ریاستیں بنیں۔ پھر یہ بھی بتایا گیا کہ قومی تحریکیں کس طرح سے سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ جڑی ہوئی تھیں اور یہ بھی کہ اس سرمایہ کاری اور منڈی کی تقسیم پر کس طرح سے مختلف قوموں کی لڑائی ہوتی رہی۔ آخر میں یہ بتایا گیا کہ اس لڑائی کو ختم کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ اور اس کا حل کیا ہے؟ اور وہ یہ تھا کہ جب تمام قومیں معاشی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی اعتبار سے برابر ہونگی تو پھر ان میں لڑائیاں نہیں ہونگی۔

اس لیکچر میں یہ بیان کریں گے کہ نیشنلزم یا قومیت پسندی کے برصغیر میں کیا اثرات ہوئے؟ خاص طور پر بھارت اور پاکستان کی آزادی کے حوالے سے اس کا جائزہ لیا جائے گا۔ ہندوستان کے لوگوں نے برطانوی حکومت کے خلاف کئی دفعہ بغاوتیں کیں۔ جو بہت بڑی بغاوت تھی اسے برصغیر کے لوگ جنگ آزادی کہتے ہیں جبکہ انگریز اسے بغاوت کہتے ہیں۔ یہ 1857ء میں وقوع پذیر ہوئی جس میں ہندوستانیوں نے بہادر شاہ ظفر کو دوبارہ سے بادشاہ بنانے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہیں ہوسکی۔ 1857ء کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ برطانیہ نے بہت سارے ہندوستانیوں کو یہ دعوت دی کہ وہ برطانیہ آکر پڑھیں۔ اس میں کئی لوگ گئے اور وکیل بنے۔ محمد علی جناح نے بھی لنکنز ان سے اپنی ڈگری حاصل کی۔ نہرو اور گاندھی وغیرہ بہت سے قوم پرست لیڈر تھے جو وہاں پر پڑھے تھے۔ وہاں پڑھنے کے دوران وہ انگلش لبرل آئیڈیاز سے بہت گہرے طور پر متاثر ہوئے۔ یہ بات بڑی حیران کن ہے کہ کچھ لوگ آج کل انٹرنیٹ پر طعنہ دینے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ تم دیسی لبرل ہو۔ اگر وہ اسٹینلے والپرٹ کی لکھی کتاب ''محمد علی جناح'' یا پھر محمد علی جناح کی کوئی بھی اور اچھی سوانح عمری پڑھیں تو ان کو شاید یہ سن کر حیرانگی ہو کہ محمد علی جناح بنیادی طور پہ جان لاک اور جان اسٹیورٹ مل کی انگلش لبرل پولیٹیکل فلاسفی سے متاثر تھے اور اس میں کوئی چھپی ہوئی بات نہیں ہے۔ آج کل پاکستان میں لبرل ہونا بڑا برا سمجھا جاتا ہے مگر بنیادی طور پر محمد علی جناح بھی ایک لبرل ہی تھے۔ یہ جو طبقہ تھا جنھوں نے یورپ سے تعلیم حاصل کی یہ وہاں کے حالات و واقعات سے پوری طرح واقف تھا اور بہت متاثر بھی تھا۔

1914ء سے 1918ء تک پہلی عالمی جنگ ہوئی۔ جس میں ایک کروڑ 60 لاکھ افراد مارے گئے۔ یہ انسانی تاریخ کا بہت بڑا واقعہ تھا اور اس کے بہت گہرے اثرات بھی ہوئے۔ اس جنگ کی بہت ساری وجوہات تھیں مگر بنیادی وجہ اس کی یہ تھی کہ جو یورپ کے اندر نیشنل ازم ابھر رہا تھا وہ بڑی بڑی سلطنتوں سے ٹکرا رہا تھا۔ خاص طور پر بالکن ریاستوں کے اندر جو سربین قوم پرستی تھی اس کا آسٹرو ہنگیرین سلطنت کے ساتھ جب ٹکراؤ ہوا تو اس کے نتیجے میں ایک کیسکیڈ ایونٹ شروع ہوا، ایک ڈومینو ایفیکٹ شروع ہوا۔ وہاں لوگ ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے عالمی جنگ شروع ہوگئی۔ جب عالمی جنگ ختم ہوئی تو آسٹرو ہنگیرین سلطنت ٹوٹ گئی۔ آسٹریا الگ ہوگیا ہنگری الگ ہوگیا۔ ان کی بہت ساری بالکن ریاستیں بھی الگ ہوگئیں۔ اس جنگ کے نتیجے میں عثمانیہ سلطنت بھی

ٹوٹی۔ جرمنی نے جن بہت ساری ریاستوں پر قبضہ کیا ہوا تھا وہ بھی الگ ہوگئیں۔ ان سب علاقوں کو اس جنگ کے فاتحین نے دوبارہ سے تشکیل دینا تھا۔ امریکہ کے صدر ووڈرو ولسن نے یہ تجویز کیا اور اس پہ مہم بھی چلائی کہ سب ملکوں کی حدود اس بات پر رکھی جائیں گی کہ ایک زبان کے لوگ ایک ریاست میں رہیں گے۔ ہم قومیت کی بنیاد پر ریاستیں قائم کریں گے تو آئندہ سے قوم پرستی یعنی کہ نیشنلزم اس طرح سے نہیں ابھرے گا اور عالمی جنگ جیسے واقعات نہیں ہونگے۔ یہ تصور لیگ آف نیشنز کی بنیادی سوچ بنی۔ 1918ء سے لے کر 1920ء تک اور اس کے بعد بھی لیگ آف نیشنز نے یہی کوشش کی کہ آسٹرو ہنگیرین، عثمانیہ اور جرمنی کی سلطنتیں جو ٹوٹی ہیں اور اس کے نتیجے میں جو چھوٹی چھوٹی قومیں آزاد ہوئی ہیں ان کی الگ الگ ریاستیں بنادی جائیں تاکہ آئندہ کبھی اس طرح سے جنگ کی نوبت نہ آئے۔

یہ تصور کہ اگر آپ ایک قوم ہیں آپ کا یہ حق ہے کہ آپ اپنی الگ ریاست بنا سکتے ہیں۔ یہ تصور پوری دنیا کے اندر 1920ء کے عشرے میں لیگ آف نیشنز کی وجہ سے پھیلنا شروع ہوا۔ وہ ہندوستانی جو کہ انگلینڈ کے حالات و واقعات سے واقف تھے انہوں نے یہ سب اپنے سامنے دیکھا کہ کس طرح لیگ آف نیشنز بنی اور کس طرح لیگ نے چھوٹی چھوٹی قوموں کو آزاد کیا اور ان کی الگ الگ ریاستیں قائم ہوئیں۔ انہوں نے اسی دلیل کو ہندوستان پر لاگو کیا۔ انہوں نے یہ کہا کہ جس طرح سے آپ یہ تصور کرتے ہیں کہ انگلینڈ ایک قوم ہے یا فرانس ایک قوم ہے ہم آپ کے سامنے یہ تصور پیش کرتے ہیں کہ پورے کا پورا ہندوستان ایک قوم ہے۔ اور چونکہ ہندوستان ایک قوم ہے لہذا اس کو بھی آزاد ہونا چاہئے۔ 1929ء کے لاہور کنونشن میں انڈین نیشنل کانگریس نے یہ قرارداد پاس کی کہ اب سے کانگریس مکمل آزادی کے لیے کام کرے گی۔ کیوں کہ ہندوستان ایک قوم ہے اور جس طرح یورپ کے اندر قوموں کو حقوق ملے اس طرح پورے کے پورے ہندوستان کو بھی یہ حق ملنا چاہئے کہ ہم اپنی آزاد ریاست قائم کریں۔ یہ بڑی طاقتور دلیل تھی کیونکہ ہندوستانیوں نے انگلینڈ کی دلیل کو ان کے ہی منہ پر مار دیا اور کہا کہ ہم بھی ایک قوم ہیں ہمیں کیوں نہیں آزاد کیا جارہا؟ ہم کیوں ایک آزاد ریاست نہیں بنا سکتے؟

جب یہ نظریہ پھیلا کہ ہندوستانی بھی ایک قوم ہیں۔ اس کے چند سال بعد ہی اس مسئلے نے سر اٹھالیا کہ ہندوستان میں ایک قوم نہیں بلکہ دو قومیں ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ علامہ اقبال نے 1930ء میں کیا لکھنا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ بتدریج مسلم لیگ نے اس سوچ کو اختیار کیا اور بالآخر 1940ء میں لاہور میں یہ قرارداد پیش کی گئی کہ ہندوستان میں دو قومیں وجود رکھتی ہیں۔ محمد علی جناح نے کہا کہ ایک ہندو قوم ہے اور ایک مسلمان قوم ہے، دونوں کے نقطہ نظر، کلچر اور ثقافت الگ الگ ہیں۔ اس طرح یہ دو قومی نظریہ بن گیا۔ جب لاہور قرارداد پاس ہوئی تو اس وقت پاکستان کا نام استعمال نہیں کیا گیا۔ بعد میں اس کا نام قرارداد پاکستان رکھا گیا۔ اس کی ایک علیحدہ تاریخ ہے۔

ہندوستان میں اس وقت ایک نظریہ یہ تھا کہ ہندوستان میں ایک قوم ہے دوسرا نظریہ یہ تھا کہ ہندوستان میں دو قومیں آباد ہیں۔ جو کہتے تھے کہ ہندوستان ایک قوم ہے وہ کانگریس پارٹی میں تھے اور جو کہتے تھے ہندوستان میں دو قومیں ہیں وہ مسلم لیگ میں تھے۔ مگر ایک تیسرا نظریہ بھی تھا جو بہت دلچسپ ہے اور وہ یہ ہے کہ کانگریس پارٹی کے ساتھ جو لوگ اور دانشور تھے ان کا کہنا تھا کہ نہ تو انڈیا میں ایک قوم آباد ہے اور نہ اس میں دو قومیں آباد ہیں بلکہ قوم کی جو تعریف ہے اس کی بنیاد زبان اور علاقے پر ہوتی ہے۔ اگر ہم زبان، علاقے، ثقافت

اور معیشت کی بنیاد پر مطالعہ کریں تو ہندوستان میں نہ تو ایک قوم ہے اور نہ دو قومیں ہیں بلکہ ہندوستان کے اندر 17 قومیں آباد ہیں۔ یہ بڑی دلچسپ بات ہے۔ اگر ہندوستان کے اندر 17 قومیں رہ رہی ہیں تو اتنی ساری قوموں کو کس طرح سے اکٹھا رکھا جا سکتا ہے؟ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے یہ کہا کہ کانگریس کا نظریہ بالکل غلط ہے کانگریس یہ سمجھتی ہے کہ ہندوستان میں ایک قوم ہے اس لیے کانگریس وہ پالیسی بنا ہی نہیں رہی جس کے نتیجے میں یہ 17 قومیں اکٹھی رہ سکیں۔ اس لیے وہ مسلم لیگ کے جو جائز مطالبات ہیں ان کو بھی پورا نہیں کر رہی جس سے ہندوستان کے اندر تقسیم پیدا ہو رہی ہے۔ اگر کانگریس یہ قبول کر لے کہ بھارت ایک کثیر القومی ریاست ہے۔ جس کے اندر ایک نہیں دو نہیں 17 قومیں آباد ہیں اور ہر قوم کو برابر کے حقوق ملنے چاہئیں۔ ان کی زبان، ان کی ثقافت کو برابر تسلیم کیا جائے اور ان کو معاشی حقوق کی برابری ملے تب جا کر لڑائی جھگڑے کے بجائے بھائی چارے کا ماحول پیدا ہو سکے گا۔ جس سے ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کا مسئلہ جو کھڑا ہو گیا ہے وہ حل ہو گا۔ یعنی یہ کہنا درست نہیں ہو گا کہ سی پی آئی نے کہا کہ پاکستان بن جائے یا سی پی آئی نے یہ کہا کہ پاکستان نہ بنے۔ سی پی آئی نے بنیادی طور پر یہ کہا کہ جو کانگریس کی پالیسی ہے وہ غلط ہے اور جب تک یہ پالیسی تبدیل نہیں ہو گی ہندوستان میں کشیدگی پیدا ہو گی۔ سی پی آئی نے مزید یہ کہا کہ جو 17 قومیں ہیں ان کو حق خود ارادیت حاصل ہونا چاہئے اور ساتھ ہی ساتھ علیحدگی کا حق بھی ہونا چاہئے۔ وہ قومیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اگر وہ ہندوستان کے اندر نہیں رہنا چاہتیں تو ان کو ہندوستان کے اندر نہیں رکھنا چاہئے۔ وہ اپنا ایک ملک بنانا چاہیں یا ایک سے زیادہ ملک بنانا چاہیں تو یہ ان کا حق ہے۔ یہ بڑی ریڈیکل پوزیشن تھی۔ اسی پوزیشن کی وجہ سے کانگریس نے سی پی آئی کے خلاف آزادی اور تقسیم کے بعد بھرپور پروپیگنڈہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ سی پی آئی پاکستان کی حمایتی ہے اور وہ ہندوستان کی مخالف اور دشمن ہے یعنی کہ وہ غدار ہے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اگرچہ کمیونسٹوں نے ہندوستان کی تقسیم کے وقت اتنا ترقی پسند نقطہ نظر رکھا کہ اگر کسی قوم کی اکثریت کسی ایک ملک میں نہیں رہنا چاہتی تو ان کے پاس حق ہے کہ وہ علیحدہ ملک بنا لیں۔ مگر پاکستان کے اندر بالکل الٹ پروپیگنڈا ہوا۔ پاکستان میں کہا جانے لگا کہ کمیونسٹ پاکستان کے مخالف اور ہندوستان کے حامی ہیں۔ یعنی ہندوستان میں یہ پروپیگنڈا ہوا کہ وہ پاکستان کے حمایتی ہیں اور پاکستان میں یہ پروپیگنڈا ہو کہ وہ ہندوستان کے حمایتی ہیں۔ اس میں ایک اور دلچسپ بات میں آپ کو یہ بتاتا ہوں کہ پاکستان میں جو لوگ تقسیم کے خلاف تھے وہ کمونسٹوں پر الزام لگاتے تھے کہ وہ تقسیم کے حق میں ہیں اس لئے وہ بہت برے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہاں میں نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے ڈاکومنٹس کے لنک بھی دیے ہیں۔ اگر مزید تفصیل جاننا چاہیں تو آپ ان کو پڑھ سکتے ہیں۔

ہندوستان تقسیم ہوا۔ پاکستان بن گیا اور بہت خون خرابہ ہوا یہ سب چیزیں آپ کے سامنے ہیں۔ ہم یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ دو قومی نظریہ اور ہندوستان میں کانگریس کا ایک قوم کا نقطہ نظر دونوں نقطہ ہائے نظر کو حقیقت پسندی سے پرکھنے کے لیے ہمیں انہیں اس پس منظر میں دیکھنا چاہیے جب لیگ آف نیشنز کے فیصلے ہوئے اور کلونیل ازم کے خلاف لڑائی تھی۔ لیکن اگر ہمیں اپنے معاشرے کو دیکھنا ہے، اسے سمجھنے کی کوشش کرنا اور یہاں بھائی چارے کا ماحول قائم کرنا ہے تو ہمیں بڑی سنجیدگی سے مادی معروضی حالات کو سمجھتے ہوئے اپنی پالیسی بنانا ہو گی۔ اور وہ پالیسی یہ ہے کہ ہمیں اس حقیقت کو بہر حال سمجھنا ہو گا اور تسلیم کرنا ہو گا کہ کہ ہم ایک کثیر القومی ریاست ہیں۔

ہندوستان بھی ایک کثیر القومی ریاست ہے اور پاکستان بھی ایک کثیر القومی ریاست ہے۔اس میں کوئی بری بات نہیں۔آپ کو بتا رہا ہوں کہ دنیا میں زیادہ تر ملک کثیر القومی ریاستیں ہی ہیں۔کثیر القومی ریاست کو اگر آپ تسلیم کر لیں تو پھر آپ وہ پالیسیاں بنانا شروع کریں گے جو لوگوں کو اکٹھا کرے نہ کہ ان کو تقسیم کرے۔

وہ پالیسیاں کیا ہیں؟ وہ پالیسیاں یہ ہیں کہ ہر قوم کی نمائندگی ہو، ہر قوم کے برابر کے جمہوری حقوق ہو۔ ہر قوم کی زبان کو برابر تسلیم کیا جائے۔ ہر قوم کی ثقافت کو برابر تسلیم کیا جائے۔اور سب سے اہم یہ کہ ہر قوم کو معاشی اعتبار سے برابر کیا جائے۔مثال کے طور پر بلوچستان کا ہیومین ڈیولپمنٹ انڈیکس بہت نیچے ہے اس کے مقابلے میں پنجاب کا ہیومین ڈویلپمنٹ انڈیکس کافی اوپر ہے تو ظاہری بات ہے دونوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہوگی۔ بلوچ اس کے خلاف مزاحمت کریں گے کہ پنجابی کیوں اتنا آگے ہیں اور ہم کیوں اتنا پیچھے ہیں۔جب تک ہیومین ڈویلپمنٹ انڈیکس دونوں کا برابر نہیں ہوگا تو بھائی چارے کا ماحول بھی پیدا نہیں ہوگا۔ہیومین ڈویلپمنٹ انڈیکس تین چیزوں پر بنیاد رکھتا ہے۔سب سے پہلے تو آمدنی، اس کے بعد صحت عامہ کے اعداد و شمار یعنی اوسط عمر وغیرہ، تیسرے خواندگی کی شرح۔جب تک یہ اعداد و شمار تمام قوموں کے برابر نہیں ہوں گے یا پھر ہندوستان میں 17 قوموں کے برابر نہیں ہوں گے، اس وقت تک بھائی چارے کا ماحول پیدا نہیں ہوگا۔ یہ ایسی منزل ہے جو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔اگر کبھی ہمیں یعنی بائیں بازو کو موقع ملے کہ وہ پاکستان میں حکومت بنائے تو ہم یہی کریں گے کہ پاکستان کی تمام قوموں کو مکمل طور پر معاشی اعتبار سے سیاسی اعتبار سے ثقافتی اعتبار سے اور سماجی اعتبار سے برابر لے کر آئیں گے اور پھر آپ دیکھیں گے کے لوگوں کے درمیان کشیدگی ختم ہو جائے گی اور ان کے درمیان بھائی چارے کا ماحول پیدا ہوگا۔ ہمارے بہت سارے نوجوان یہ کہتے ہیں جناب ہم پنجابی تو بن گئے، بلوچ بن گئے، پشتون بن گئے، سندھی بن گئے لیکن ہم پاکستانی قوم نہیں بن سکے۔ وہ بڑے جذباتی ہو کر یہ تقریریں کرتے ہیں۔اس نعرے میں، اس کی ساخت میں اور اس نقطہ نظر میں دو بہت بڑے عیب ہیں۔ایک تو یہ کہ جب آپ پاکستانی ہونے کو پنجابی ہونے، پشتون ہونے، سندھی ہونے یا بلوچ ہونے سے متضاد ٹھہرا دیتے ہیں تو پھر آپ اس چیز کو سمجھ ہی نہیں رہے ہیں کہ پاکستان میں ایک قوم نہیں ہے بلکہ یہ ایک کثیر القومی ریاست ہے۔

دوسری بات یہ کہ متحد ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ایک قوم بنیں۔ چار قومیں بھی اسی طرح متحد ہو سکتی ہیں جس طرح ایک قوم متحد ہوتی ہے۔شرط صرف یہ ہے کہ وہ چاروں قومیں اگر برابری کی سطح پر ہوں تو پھر ان چاروں قوموں کے درمیان وہ اتحاد ہوگا جو ہمیں ایک قوم میں نظر آتا ہے۔اس چیز کو ہم سمجھ لیں کہ اگر پاکستان ایک کثیر القومی ریاست ہے ہم اس کو فوری طور پر ایک قوم نہیں بنا سکتے۔ کیونکہ قوم بننے میں صدیاں لگ جاتی ہیں پچاس ساٹھ سال میں قومیں نہیں بنتی۔ہم اتنی جلدی ایک قوم نہیں بن سکتے مگر جو قومیں ہیں، جو مختلف نسلی گروپ ہیں اور جو مختلف مذاہب ہیں، جو تنوع ہے ان کو ہم اکٹھا کر سکتے ہیں اور ان میں اتحاد پیدا کر سکتے ہیں۔شرط صرف یہ ہے کہ ہم تمام قوموں کو برابر کے حقوق دیں۔تمام مذاہب کو برابر کے حقوق دیں۔معاشی طور پر بھی وہ برابر ہو اور سماجی طور پر بھی وہ برابر ہوں۔ اگر پاکستان میں بائیں بازو کو حکومت ملتی ہے تو ہمیں اپنے مقاصد اور منزل کا تعین کرنا ہوگا۔ہم تین چیزوں میں برابری پیدا کر دیں تو زیادہ تر مسئلے حل ہو جائیں گے۔ پہلی بات یہ کہ ہیومن ڈویلپمنٹ انڈیکس ہر قوم کا برابر ہونا چاہیے۔اس انڈیکس میں مزید تین چیزیں شامل ہیں،

سب کی آمدنی، صحت کی سہولیات اور تعلیم کی سہولیات برابر ہونی چاہئیں۔ دوسرے یہ کہ تمام زبانوں کو برابر کے حقوق ملیں اور ان کو برابر تسلیم کیا جائے۔ یا تو کوئی بھی سرکاری زبان نہ رکھیں یا تمام زبانوں کو سرکاری درجہ دے دیا جائے تا کہ کسی ایک زبان کو دوسری پر فوقیت حاصل نہ ہو۔ یہ صدیوں سے طے شدہ ہے کہ جہاں بھی شمالی ہندوستان کے لوگ اکٹھے ہوں گے وہ ہندی اردو ہی میں ہی بات کریں گے۔ یہ رابطے کی زبان آج سے نہیں ہے بلکہ یہ سات آٹھ سو سال پہلے سے ہے کہ شمالی ہندوستان کے لوگ ہندی اردو ہی میں بات کرتے ہیں۔ اس کو مسلط کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں پر بلوچ، سندھی، پشتون، پنجابی اکٹھے ہوں گے وہ آپس میں اردو ہی میں بات کریں گے۔ اس کو زبردستی جب آپ ٹھونستے ہیں تو اس کا ردعمل ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہوگا تو آپ دیکھیں گے کہ لوگ خوش ہوں گے۔ تیسری بات یہ کہ تمام قوموں کے برابر کے وفاقی حقوق ہوں۔ صحیح معنوں میں ایک وفاقی ریاست قائم ہو جس کی تمام اکائیوں میں سیاسی، ثقافتی اور معاشی اعتبار سے برابری ہو۔ ان تین پہلوؤں سے اگر برابری قائم ہوگی تو پھر کوئی قوم بھی علیحدہ نہیں ہونا چاہے گی بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا ماحول پیدا ہوگا اور سب ایک دوسرے کے ساتھ رہنا چاہیں گے۔ اگر ہم پاکستان میں یہ صورت حال قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو ہوسکتا ہے دیگر قوموں کے لوگ بھی یہ کہیں کہ ہمیں بھی پاکستان کے اندر شامل کرو کہ اتنا خوبصورت ملک ہے، یہاں اتنی برابری ہے، یہاں پر لوگوں کا احترام کیا جاتا ہے اور ان کی عزت کی جاتی ہے۔ پاکستان کے اندر موجود قومی سوال کا یہ سوشلسٹ حل ہے۔

چار اصطلاحات کا تعارف

Atheism,Agnosticism,Liberalism,Socialism

میری سوشل میڈیا پر پوسٹس وغیرہ پر کمنٹ کرتے ہوئے بعض لوگ میری ذات کے حوالے سے دیسی لبرل وغیرہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔لیکن اگر ان سے پوچھا جائے کہ اس لفظ کی تعریف کریں کہ لبرل ہوتا کیا ہے؟ دیسی لبرل اور فرنگی لبرل میں کیا فرق ہے؟ یا سیکولرزم کیا ہوتا ہے؟ ایتھزم اور ایگناسٹسزم کیا ہوتے ہیں؟ سوشلزم کیا ہوتا ہے؟ یا سوشل ڈیموکریسی کسے کہتے ہیں؟ تو وہ ان اصطلاحات کی تعریف نہیں کر سکتے ان کا مفہوم خود ان پر واضح نہیں ہوتا کہ دراصل یہ ہیں کیا؟ ان اصلاحات کی وضاحت ہم ایتھزم سے شروع کرتے ہیں۔تھیاس کا مطلب ہے خدا، ایتھیاس وہ شخص ہے جو خدا پر یقین نہیں رکھتا۔ایتھیسٹ وہ لوگ ہیں جو خدا پر یقین نہیں رکھتے۔اسی سے انگریزی لفظ نکلا ہے ایتھزم جس کا مطلب ہے خدا پر یقین نہ رکھنا۔

اگناسٹک کیا ہوتا ہے؟ ناسٹک کا مطلب ہے علم، روشنی۔اگناسٹک کا مطلب ہے جو کہے مجھے علم نہیں مجھے پتا نہیں۔ مجھے معلوم نہیں خدا ہے یا نہیں ہے۔ میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔نہ میں یہ کہہ سکتا ہوں خدا ہے، نہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ خدا نہیں ہے۔

اب آتے ہیں سیکولرازم کی طرف، سیکولرزم ایک پولیٹیکل فلاسفی ہے۔ یہ نہ ایتھیزم ہے اور نہ ایگناسٹسزم ہے۔اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ریاست اور مذہب کے امور الگ الگ رہیں۔ یہ نہیں کہ مذہب نہ ہو بلکہ یہ کہ مذہب کا ریاست کے امور سے کوئی تعلق نہ ہو۔انگریزی میں جملہ استعمال کیا جاتا ہے Seperation of Church and State۔

اس کا مطلب محض یہ ہے کہ وہ امتیازی قوانین جو اقلیتوں کے خلاف امتیاز برتیں ان کو ختم کر دیا جائے۔اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ مذہب کو ختم کر دیا جائے یا مساجد کو بند کر دیا جائے۔ بلکہ اس کا مطلب اس کے بالکل الٹ ہے۔سیکولرزم یہ کہتا ہے کہ تمام مذاہب کو عزت دی جائے اور شعور کی آزادی کو فروغ دیا جائے۔ ہر کمیونٹی کو یہ حق ہونا چاہیے کہ وہ اپنے مذہب پر عمل کر سکے اور ریاست اس میں کسی قسم کی دخل اندازی نہ کرے۔اس کا مطلب ہے کہ معاشرے میں جتنے بھی مذاہب موجود ہیں ریاست کا کردار ان کے درمیان غیر جانبدار انہ ہو۔کسی ایک مذہب کو دوسرے پر فوقیت نہیں دے یا کسی ایک مذہب کو کوئی فائدہ نہ پہنچائے۔وہ ان معاملات سے بالا رہے۔

اب بات کرتے ہیں لبرلزم کی۔لبرل ازم کی بنیاد دو چیزوں پر ہے وہ ہیں آزادی اور برابری۔اس میں کئی چیزیں آتی ہیں۔۔مثال کے طور پر قانون کے سامنے برابری بہت اہم چیز ہے۔یعنی ہر شہری کا برابر قانونی حق ہونا چاہیے اور اس کا برابر سیاسی حق ہونا چاہیے۔لبرلز لبرٹی کی تعریف کرتے ہیں کہ شہری قانون کے اندر رہتے ہوئے جو مرضی فیصلے کریں۔چاہے وہ ان کی ذات کے حوالے سے ہوں یا اپنی جائیداد کے حوالے سے، یہ ان کا حق ہونا چاہیے۔اسی کو وہ انفرادی آزادی بھی کہتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ لبرل آزادی اظہار کی بات کرتے ہیں۔ پریس کی آزادی کی بات کرتے ہیں۔ مذہب کی آزادی کی بات کرتے ہیں یعنی وہ سیکولرزم پر یقین رکھتے ہیں۔ ہر لبرل سیکولر ضرور ہوتا ہے۔وہ آزاد منڈی پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ لبرلزم کا بہت اہم حصہ ہے کہ وہ نجی جائیداد کی حمایت کرتے ہیں۔ ہر انسان کے پاس

نجی جائداد ہونا چاہیے بلکہ اسے یہ حق بھی ہونا چاہیے کہ وہ اس جائیداد کو جس طرح چاہے استعمال کر سکے۔یعنی کہ لبرلز بنیادی طور پر سرمایہ داری کے حمایتی ہوتے ہیں۔وہ جمہوریت پر یقین رکھتے ہیں جس سے مراد ان کی یہ ہے کہ الیکشن ہوں اور حکومت الیکشن کی بنیاد پر بنے اور اسی بنیاد پر سیاسی پارٹیاں اقتدار میں آئیں۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ سارے لبرل سیکولر ہوتے ہیں۔لبرل ازم اور سیکولرزم دونوں بنیادی طور پر اس وقت پیدا ہوئے تھے جب یورپ میں اس وقت کا سرمایہ دار طبقہ بادشاہت کے خلاف اور لینڈ لارڈز کے خلاف بغاوت کر رہا تھا۔1688ء میں گلوریس ریوولوشن ہوا،اس دوران جان لاکس نے تحریریں لکھیں۔جن کی بنیاد پر وہ فادر آف لبرلزم مانا جاتا ہے۔اس ریوولوشن پر جان لاک کی تحریروں کا بہت زیادہ اثر تھا۔اسی طرح 1776ء کے امریکی ریوولوشن پر خیالات کے بہت زیادہ اثرات تھے۔اور جو 1779ء میں انقلاب فرانس ہوا وہ بھی لبرل تصورات سے متاثر تھا۔لبرلز ہمیشہ وراثتی سیاست کے خلاف رہے۔وہ بادشاہت کے خلاف تھے اور ریاست کا کوئی ایک مذہب ہو اس کے بھی خلاف تھے۔

اب جمہوریت کی بات کرتے ہیں جس کو انگریزی میں ڈیموکریسی کہتے ہیں۔سوشل میڈیا پر اکثر لوگ ڈیموکریسی کو امریکی سازش قرار دیتے ہیں۔لیکن ڈیموکریسی ایک یونانی لفظ ہے۔جو دو لفظوں سے مل کر بنا ہے ایک ڈیموس دوسرا کریسی،ڈیموس کا یونانی زبان میں مطلب ہے عوام،وہ لوگ جن کی جائدادیں نہ ہوں یعنی غریب لوگ۔اور کریسی کا مطلب ہے اقتدار۔یعنی جب غریب لوگوں کا اقتدار قائم ہوتا ہے تو اس کو ڈیموکریسی کہا جاتا ہے۔ابراہیم لنکن نے اس کی جو تعریف دی وہ بہت جامع اور مختصر ہے۔

Democracy is the Government By the People, of the People and for the People۔لوگوں کی حکومت, لوگوں کے لیے حکومت اور لوگ خود ہی حکومت کریں۔یہ اس کی تعریف ہے۔ارسطو نے بھی اس کی بڑی دلچسپ تعریف کی ہے اس کے مطابق جب وہ طبقہ اقتدار میں آجائے جس کے پاس کوئی جائداد نہ ہو تو اسے ڈیموکریسی کہتے ہیں۔لبرل ازم اور سوشلزم کے درمیان یہی بنیادی فرق ہے۔لبرل بھی سیکولرزم اور جمہوریت پر یقین رکھتا ہے اور سوشلسٹ بھی سیکولرزم اور جمہوریت پر یقین رکھتا ہے۔لیکن دونوں جمہوریت کی تعریف بڑی مختلف کرتے ہیں۔لبرلز کہتے ہیں کہ اگر ایک خاص وقفے سے تسلسل کے ساتھ الیکشن ہو رہے ہیں اور اس الیکشن کے نتیجے میں حکومت بن رہی ہے تو یہی جمہوریت ہے۔لیکن سوشلسٹ کہتے ہیں کہ جب تک معاشرے کا طبقاتی کردار تبدیل نہیں ہوگا اس وقت تک حقیقی جمہوریت شروع نہیں ہوگی۔الیکشن کے ذریعے جو جمہوریت ہے وہ صرف سرمایہ داروں کی جمہوریت ہے۔اسی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو سوشلسٹ اور لبرل ڈیموکریٹس ہیں ان کے درمیان بہت بنیادی اختلاف ہے۔لبرل ڈیموکریٹس سرمایہ داری کی حمایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر الیکشن ہو گیا تو یہ جمہوریت ہے۔سوشلسٹ سرمایہ داری نظام کے سخت مخالف ہیں اور وہ یہ کہتے ہیں کہ جب تک معاشرے کا طبقاتی کردار تبدیل نہیں ہوتا اس وقت تک حقیقی جمہوریت کا آغاز نہیں ہو سکتا۔

آیئے اب اس چیز پر بھی بات کرتے ہیں کہ ہر سوشلسٹ سیکولر ضرور ہوتا ہے اور ہر لبرل بھی سیکولر ہوتا ہے لیکن ہر سیکولر آدمی لبرل یا

سوشلسٹ نہیں ہوتا۔ بہت سارے ایسے لوگ ہیں جو سیکولر تو ہیں لیکن آمریت پر یقین رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ فوجی آمریت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک فوج اقتدار میں آئے تو بہتر ہے۔

بہت سے سیکولر لوگوں نے پاکستان میں مشرف کے حمایت کی اور اس سے پہلے ایوب خان کی حمایت بھی کی۔ اس سے یہ اندازہ ہے کہ ضروری نہیں جو شخص سیکولر ہے وہ لبرل بھی ہو یا وہ سوشلسٹ بھی ہو۔ اسی طرح جو بھی ملحد یا متشکک ہے میرا خیال ہے کہ وہ سیکولر ضرور ہوگا لیکن ضروری نہیں کہ کوئی ملحد اور متشکک لبرل یا سوشلسٹ بھی ہو۔ ضروری نہیں جو سوشلسٹ ہو وہ ملحد یا متشکک بھی ہو۔ بہت سارے مذہبی لوگ یہ کہتے ہیں کہ معاشرے کے جو وسائل ہیں وہ عوام کے کنٹرول میں معاشرے کے کنٹرول میں یا ریاست کے کنٹرول میں ہونے چاہئیں۔ لیکن وہ مذہبی نقطہ نظر بھی رکھتے ہیں وہ مذہب پر یقین رکھتے ہیں اور خدا کو بھی مانتے ہیں۔

ان چیزوں میں اکثر لوگ کنفیوز ہو جاتے ہیں۔ ایتھزم کا مطلب ہے وہ لوگ جو خدا پر یقین نہیں رکھتے اگناسٹسزم کو ماننے والے وہ لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ خدا ہے بھی یا نہیں۔ سیکولر وہ لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ریاست اور مذہب کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ لبرل وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ فری مارکیٹ اکانومی ہونی چاہیے اور الیکشن وغیرہ ہونے چاہیے۔ ڈیموکریسی کا مطلب ہے عوام کی حکومت۔ اس میں دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جو لبرل ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ الیکشن ہی کافی ہیں۔ دوسرے وہ لوگ جو سوشلسٹ ہیں وہ کہتے ہیں کہ سوسائٹی میں الیکشن کے علاوہ بھی تبدیلیوں کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ معاشرے کا طبقاتی کردار تبدیل ہونا چاہیے۔ آخر میں یہ وضاحت ایک مرتبہ پھر ضروری ہے کہ سوشلسٹ سیکولر تو ہیں مگر وہ لبرل نہیں ہیں۔ وہ جمہوریت پسند بھی ہیں مگر لبرل انداز جمہوریت کو نہیں مانتے۔ ان کی جمہوریت کی تعریف لبرلز سے مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ معاشرے کا طبقاتی کردار تبدیل ہو۔

امید ہے ان اصطلاحات کی وضاحت سے اب آپ کو بہتر سمجھ آئے گی کہ کون دیسی لبرل ہے اور کون دیسی سوشلسٹ ہے۔ اس قسم کے گالی گلوچ والے لفظوں کو، جو لوگ گفتگو میں استعمال کرتے ہیں ان کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ ان کے استعمال سے دوسروں کی بے عزتی کی جائے۔ لیکن اس رویہ سے ہم بحث مباحثے اور سیاسی تفہیم میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتے بلکہ پیچھے جاتے ہیں۔ کیونکہ بنیادی ایشوز اور اصولوں پر توجہ نہیں ہوتی اور نہ ہی ان پر بحث ہوتی ہے۔ اب امید ہے کہ ہم گالی گلوچ سے آگے نکل کر ان چیزوں پر بھی بحث کر پائیں گے کہ کون سا ایسا نظام ہے جو پاکستان کے لوگوں کے لئے اور یہاں کے مزدوروں اور کسانوں کے لیے بہتر ہے۔

سوشلزم اور کمیونزم کے درمیان فرق

یہاں جس سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ سوشلزم اور کمیونزم میں کیا فرق ہے؟ دیکھا گیا ہے کہ جب نوجوان بائیں بازو کی سیاست کے قریب آتے ہیں اور اس کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اکثریت کے ابتدائی سوالوں میں یہ سوال بھی ہوتا ہے کہ سوشلزم اور کمیونزم میں کیا فرق ہے؟ ان دونوں الفاظ کی جڑیں فرانسیسی زبان میں ملتی ہیں اور دونوں اصطلاحات کا تعلق انیسویں صدی سے ہے۔ کمیونزم کا لفظ کمیون سے نکلا ہے، اسی سے کمیونٹی کا لفظ نکلا ہے اور اسی سے کمیونسٹ نکلا ہے۔ جب کمیونٹی کے پاس معاشی وسائل کا کنٹرول ہو تو پھر ہم اس کو کہتے ہیں کہ یہ کمیونسٹ سوسائٹی ہے اور یہاں کمیونزم پایا جاتا ہے۔ سوشلزم کا لفظ بھی اس سے بہت زیادہ ملتا جلتا ہے۔ یہ بھی انیسویں صدی کا لفظ ہے۔ اس کی بنیاد لفظ سوسائٹی اور سوشل ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جب وسائل اور ذرائع پیداوار سوسائٹی کے کنٹرول میں ہوتے ہیں تو اسے ہم سوشلزم کہتے ہیں۔ ان دونوں میں بس اتنا فرق ہے کہ کمیونزم کا مطلب ہے کہ وسائل کمیونٹی کی ملکیت ہوں جب کہ سوشلزم کا مطلب ہے وسائل سوسائٹی کی ملکیت ہوں۔

جب کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز انیسویں صدی میں سوشلزم اور کمیونزم کے حوالے سے لکھ رہے تھے تو وہ اکثر ان دونوں لفظوں کو ایک دوسرے کے متبادل کے طور پر بھی استعمال کر لیتے تھے۔ کہیں وہ کمیونزم کا لفظ استعمال کرتے تھے اور کہیں اس کی جگہ سوشلزم کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ دونوں سے ان کی مراد کم وبیش ایک ہی ہوتی تھی اور کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ کارل مارکس نے "گوتھا پروگرام کی تنقید" نامی ایک کتاب لکھی۔ گوتھا پروگرام ایک بائیں بازو کی سیاسی پارٹی کا پروگرام تھا جس کا کارل مارکس نے جائزہ لیا تھا۔ اس میں کارل مارکس نے یہ بتایا کہ کمیونزم کے دو مرحلے ہیں۔ ایک کمیونزم کا بالائی مرحلہ ہے جب کہ دوسرا کمیونزم کا زیریں مرحلہ ہے۔ ان کی وضاحت کرتے ہوئے کارل مارکس نے بتایا کہ کمیونزم کے ابتدائی مرحلے میں محنت کی تقسیم کسی حد تک برقرار رہتی ہے اگرچہ سرمایہ داری نظام ختم ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ذہنی اور جسمانی کام میں فرق رہتا ہے۔ کچھ لوگ دماغی کام کرتے ہیں یہ دانشور وغیرہ ہوتے ہیں اور کچھ لوگ جسمانی محنت سے کام کرتے ہیں۔ تو یہ فرق رہتا ہے۔ مزید وہ یہ بتاتے ہیں کہ کمیونزم کے ابتدائی مرحلے میں پرولتاریہ آمریت قائم رہے گی۔ یہ پرولتاریہ آمریت کیا ہے؟ یہ بنیادی طور پر یہ تصور ہے کہ جو مزدور اور کسان ہیں یعنی کہ پرولتاری ہیں یہ استحصالی نظام کے خلاف ایک ریاست قائم کریں گے۔ یہ ریاست اس طبقہ کے خلاف ہوگی جو موجودہ استحصالی نظام کو قائم رکھنا چاہتا ہے۔ یہ اس استحصالی طبقہ یعنی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے خلاف ایک آمریت ہوگی۔

ویسے تو آمریت ایک بہت برا لفظ ہے اور پاکستان کے اندر بھی ہم اس کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں۔ آمریت ایک ایسی حکومت ہوتی ہے جس میں اقلیت اپنی حکمرانی اکثریت پر قائم کرتی ہے۔ بلکہ اکثریت کو دبا کر رکھتی ہے۔ مگر کارل مارکس کے تصور میں مزدور طبقے کی آمریت بالکل اس کے الٹ ہے۔ یہ ایسی آمریت ہے جس میں اکثریت جو کہ تعداد کے لحاظ سے اسی فیصد نوے ہیں وہ اقلیت پر اپنی حکومت قائم کرے گی۔ یعنی یہ آمریت سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی اقلیت کے خلاف ہوگی۔ یہ جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور استحصالی طبقہ کے خلاف

ایک طبقاتی آمریت ہوگی۔کارل مارکس اور اینگلز کے مطابق کمیونزم کے ابتدائی مرحلے میں یہ طبقاتی آمریت قائم رہے گی۔

اس کتاب میں کارل مارکس اور اینگلز نے دوسرا فرق یہ لکھا کے کمیونزم کے ابتدائی مرحلے میں سرمایہ دارانہ حق قائم رہے گا۔سرمایہ دارانہ حق کیا ہے؟اس کا مطلب ہے کہ جو شخص زیادہ کام کرتا ہے یا زیادہ مہارت والا کام کرتا ہے اسے زیادہ تنخواہ ملنی چاہیے۔کارل مارکس اور اینگلز نے یہ کہا کہ کمیونزم کے ابتدائی مرحلے میں یہ سرمایہ دارانہ حق قائم رہے گا۔ اس کا مطلب ہے کچھ نابرابری کمیونزم کے ابتدائی مرحلے میں قائم رہے گی۔جب لینن نے یہ کتاب پڑھی تو اس نے کمیونزم کے ابتدائی مرحلے کے لیے جو لفظ استعمال کرنا شروع کیا وہ سوشلزم تھا جبکہ کمیونزم کے اعلی مرحلے کے لئے جو لفظ استعمال کرنا شروع کیا وہ کمیونزم تھا۔اب یہ اصطلاحات عام ہوگئی ہیں۔دنیا کے اندر جتنے بھی مارکسسٹ ہیں وہ یہی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ان کے نزدیک سوشلزم سے مراد وہ مرحلہ ہے جب سرمایہ داری نظام ختم ہوجائے اور سوشلسٹ نظام قائم ہوجائے مگر سرمایہ دارانہ نظام کے کچھ باقیات ابھی بھی قائم رہیں۔یہ باقیات کون سی ہیں؟ پہلی یہ کہ تقسیم محنت جبکہ دوسری سرمایہ دارانہ حق۔اس میں اس بات کے بھی امکانات ہیں کہ سرمایہ دارانہ طبقہ دوبارہ اپنا اقتدار قائم کرلے۔اس سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ مزدور طبقہ اپنی ریاست قائم رکھے جو طاقت کے ذریعے سرمایہ دارانہ نظام کو پیچھے دھکیل دے۔

جب سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی جانب سے مزاحمت ختم ہوجائے اور معیشت میں اتنی ترقی ہوجائے کہ بھوک اور ننگ مکمل طور پر ختم ہوسکے تو پھر ہم کمیونزم کے اعلی مرحلے میں جس کے لیے لینن صرف کمیونزم کا لفظ استعمال کرتا ہے میں داخل ہوجاتے ہیں۔اس مرحلے میں مزدور طبقے کی آمریت کا کوئی جواز نہیں بنتا اور وہ ختم ہوجاتی ہے۔حتی کہ اکثریت کی اقلیت کے خلاف آمریت بھی ختم ہوجاتی ہے۔ریاست کے اندر سرمایہ دارانہ نظام ختم ہوجاتا ہے چنانچہ ریاست کی ضرورت ہی نہیں رہتی اور ریاست آہستہ آہستہ ختم ہوجاتی ہے۔

یہ تو اس حوالے سے بات ہوئی کہ مارکسی نظریئے کے اندر سوشلزم اور کمیونزم میں کیا فرق ہے۔آیئے اب اس کو دوسرے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔جب ہم سیاست اور سیاسی نظریات کے میدان میں آتے ہیں تو وہاں پہ اگر کوئی یہ کہے کہ میں سوشلسٹ ہوں یا یہ کہے کہ میں کمیونسٹ ہوں تو ان دونوں کا موجودہ زمانے مختلف مطلب ہے۔ہاں یہ بات ضرور واضح رہنی چاہیے کہ ہر کمیونسٹ خود کو سوشلسٹ تصور کرتا ہے۔کیونکہ وہ سوشلزم کو عبوری دور سمجھتا ہے جو کہ سرمایہ داری اور کمیونزم کے درمیان آتا ہے۔لہذا مارکسسٹ نظریئے کے مطابق جو بھی ایسے ممالک ہیں جہاں پر کمیونسٹ پارٹیوں کی حکومت ہے تو کمیونسٹ انہیں سوشلسٹ معاشرے کہتے ہیں۔وہ ان کو کمیونسٹ معاشرے نہیں کہتے۔

ہر کمیونسٹ سوشلسٹ ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر سوشلسٹ کمیونسٹ ہو۔اس جملے کی وضاحت یہ ہے کہ اینگلز نے جرمنی میں ایک پارٹی بنائی تھی ''جرمن سوشلسٹ ڈیموکریٹک پارٹی'' جو بڑی مشہور ہوئی اور جرمنی کے مزدوروں کی پارٹی بنی۔یہ ایک مارکسسٹ پارٹی تھی اور اسی کے نمونے پر یورپ کے مختلف ملکوں مثلاً روس اور آسٹرو ہنگری وغیرہ اور دیگر میں اسی ماڈل پر پارٹیاں بنیں۔بعد ازاں ان پارٹیوں میں اختلاف پیدا ہوگیا کیونکہ دو ایسے لیڈر آئے جو کہ کارل مارکس اور اینگلز کے بعد بڑا اہم کردار ادا کررہے تھے۔مگر انہوں نے ایک الگ ہی نظریہ پیش کیا۔ان میں ایڈورڈ برنسٹائن اور کارل کاؤٹسکی کا نام شامل ہے۔انہوں نے یہ کہا کہ اب سرمایہ دارانہ نظام ایسے

مرحلے میں داخل ہو گیا ہے کہ ضروری نہیں ہم اسے انقلاب کے ذریعے ختم کریں بلکہ ہم ووٹ حاصل کر کے اور پارلیمنٹ میں جا کے ایسی اصلاحات لا سکتے ہیں جن سے بتدریج سوشلزم قائم ہو جائے گا۔ یعنی اب ہمیں انقلابی اقدامات کی ضرورت نہیں اور نہ ہی ہمیں سرمایہ دارانہ طبقے کے اقتدار کو الٹنے کی ضرورت ہے۔ ہم پارلیمانی راستے سے اقتدار حاصل کر لیں گے۔ ان نظریات کو اپنانے والے افراد سوشل ڈیموکریٹ یا سوشلسٹ کہلائے۔ جو ان سے اختلاف رکھتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کے حکمران طبقے کا تختہ انقلاب کے ذریعے پلٹنا ضروری ہے انہوں نے اپنا نام کمیونسٹ رکھ لیا۔ جب کوئی فرد سیاسی طور پر یہ کہے کہ میں سوشلسٹ ہوں کمیونسٹ نہیں ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ یہ تو کہتا ہے کہ وسائل پر سوسائٹی کا اجتماعی کنٹرول ہو مگر وہ یہ ضروری نہیں سمجھتا کہ حکمران طبقے کا تختہ الٹا جائے یا انقلاب برپا کیا جائے۔ اس کے برعکس جو خود کو کمیونسٹ کہتے ہیں اگرچہ وہ بھی یہی چاہتے ہیں کہ وسائل پر سوسائٹی اور عوام کا اجتماعی کنٹرول ہو۔ مگر اس کو قائم کرنے کے لئے وہ سمجھتے ہیں کہ حکومت وقت اور ریاست کے طبقاتی اقتدار کا تختہ پلٹنے اور انقلاب برپا کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ بنیادی طور پر کمیونسٹ وہ ہوتا ہے جو انقلابی سوشلسٹ ہو اور سوشلسٹ وہ ہوتا ہے جو کہ اصلاحات کے ذریعے سوشلزم لے کر آنا چاہے۔ امید ہے کہ آپ کو سوشلزم اور کمیونزم کے درمیان فرق پتہ چل گیا ہو گا۔

فاشزم کیا ہے؟

فاشزم ایک ایسی اصطلاح ہے جو ہمیں اکثر سیاست میں سننے کو ملتی ہے۔ میڈیا میں بھی سننے کو ملتی ہے، خاص طور پر انگریزی میڈیا میں یہ اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ مگر اس کے معنی کیا ہیں؟ یہ کیا تحریک تھی؟ اور اس کے مقاصد کیا ہیں؟ فاشزم کا لفظ فاشیو سے نکلا ہے۔ فاشیو لاطینی زبان کا لفظ ہے۔ لاطینی زبان وہ زبان ہے جو قدیم روم میں بولی جاتی تھی۔ قدیم روم میں فاشیو کا مطلب تھا۔ چھڑیوں کا بنڈل یا راڈز کا بنڈل۔ چھڑیوں کا یہ بنڈل اس زمانے کے مجسٹریٹ کے پاس ہوتا تھا۔ وہ گلیوں میں پھرتا تھا اور اس کے سپاہی وغیرہ یہ بنڈل اٹھا کے اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ اس کو سڑکوں یا بازار میں جو بھی نظر آجائے جو قانون کی پاسداری نہیں کر رہا وہیں پکڑ کے اس کو چھڑی سے مارتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اسے جرمانہ بھی کر سکتے تھے۔ یہ چھڑیوں کا بنڈل یا ڈنڈے سول مجسٹریٹ کا نشان ہوتے تھے۔ فاشزم بیسویں صدی میں سامنے آیا یہ بنیادی طور پر یورپ کی تحریک تھی۔ اکثر لوگ یہ نہیں جانتے کہ بیسویں صدی کی ابتدا میں فاشزم ایک مقبول تحریک تھی۔ یہ محض چند لوگ نہیں تھے جو معاشرے پر اپنا کنٹرول نافذ کرنے کی کوشش کر رہے تھے بلکہ فاشزم خاصا مقبول تھا۔

فاشزم کی سیاسی تاریخ یہ ہے کہ یہ ایک ریڈیکل اتھارٹیرنزم نیشنلزم ہے۔ یعنی کہ یہ ایک ایسی قومیت پرستی ہے کہ جو آمریت کی طرف جائے۔۔ آمریت کی طرف اس لیے کہ وہ اپنے مخالفین کو طاقت کے ذریعے دبا دینا چاہتے تھے۔ یہ مخالفین کون تھے؟ اس پر بعد میں بات کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ فاشسٹ انڈسٹری پر بھی اپنا کنٹرول نافذ کر لیتے تھے۔ اس کے علاوہ مارکیٹ اور بینکنگ وغیرہ پر بھی انہوں نے قبضہ کیا۔ پہلی فاشسٹ تحریک پہلی جنگ عظیم کے بعد ابھری مگر اس کا تصور پچھلی صدی میں بھی موجود تھا۔ کہا یہ جاتا ہے کہ فریڈرک نطشے جو عظیم جرمن فلاسفر تھا فاشزم بنیادی طور پر اس کی سوچ سے متاثر تھا۔ فریڈرک نطشے کی سوچ یہ تھی کہ عیسائیت کی وجہ سے یورپ کے اندر ایک غلامانہ ذہنیت پیدا ہو گئی ہے۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ عیسائیت بنیادی طور پر غلاموں کا مذہب تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ روم کے خلاف جو بغاوت ہوئی وہ غلاموں نے ہی کی اور عیسائیت سب سے پہلے غلاموں کے اندر ہی مقبول ہوئی۔ وہ کہتا تھا کہ عیسائیت غلامانہ ذہنیت پیدا کرتی ہے۔ اب جبکہ جدید سائنس اور ترقی کے نتیجے میں ہماری زندگی یعنی یورپ کی زندگی میں مذہب کا کردار بہت کم ہو گیا ہے۔ اب ہمیں ایک نئی ذہنیت ڈھونڈنا پڑے گی جس کی بنیاد پر ہم اپنی زندگی کو قائم کر سکیں۔ فریڈرک نطشے کا "God is dead" معروف مقولہ ہے۔ اس سے اس کی مراد یہ نہیں تھی کہ حقیقی خدا نہیں ہے بلکہ اس کی مراد یہ تھی کہ ہم نے اپنی زندگی سے خدا کو نکال دیا ہے۔ اپنی زندگی سے مذہب اور خدا کو نکال دیا ہے۔ نطشے کہتا تھا کہ اب ہم چونکہ عیسائیت پر تو انحصار کر نہیں سکتے کہ وہ ہمیں بتائے کہ اچھا کیا ہے اور برا کیا ہے۔ اس لئے ہمیں ایک نئی ذہنیت بنانا پڑے گی۔

نطشے نے سپرمین کی ذہنیت بنائی۔ یہ تھی ول ٹو پاور یعنی کہ ہمارے اندر یہ عزم ہونا چاہئے کہ ہم اقتدار اور قوت حاصل کریں۔ جو بھی بندہ سماج میں طاقتور بن سکتا ہے اور جو چیز بھی ہمیں طاقتور بناتی ہے وہی چیز اچھی ہے۔ اور جو چیز ہمیں کمزور کرتی ہے جس طرح وہ

عیسائیت کو کہتا تھا کہ یہ غلامانہ ذہنیت پیدا کرتی ہے وہ چیز بری ہے۔یعنی کہ فریڈرک نطشے قوت کو بہت پسند کرتا تھا۔ساتھ ساتھ یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ جو ابتدائی گروپ فریڈرک نطشے کو پڑھ رہے تھے جو بعد میں فاشسٹ بنے وہ قدامت پسندی کے انتہائی خلاف تھے یعنی وہ اپنے آپ کو بہت انقلابی سمجھتے تھے۔قدامت پسندی کے خلاف اس طرح سے تھے کہ جو پرانے خاندانی نظام، مذہب اور روایات کی وہ بات نہیں کرتے تھے وہ ان کے بہت خلاف تھے۔

یورپ کے اندر پہلی عالمی جنگ کے نتیجے میں سینٹرل یورپ کے اندر بہت بڑا بحران پیدا ہوا۔جرمنی کے اندر بحران تھا اٹلی کے اندر بحران تھا۔تقریباً پورے کا نٹی نینٹل یورپ کے اندر بحران تھا۔جو فاتح ممالک تھے جیسے فرانس اور برطانیہ وہاں تو بہت بڑا بحران نہیں تھا لیکن وسطی یورپ میں بہت زیادہ بحران تھا۔جو حکومتیں بنیں وہ ان بحرانوں سے نمٹ نہیں سکتی تھیں۔وہ نہ تو معاشی بحران کو دور کر سکتی تھیں اور نہ موجود سماجی بحران مثلاً اپنی قومیت پر اعتماد کی کمی سے بھی نہیں نمٹ پا رہی تھیں۔اس کے علاوہ یورپ کے اندر جو دوسرا بڑا چیلنج پیدا ہو رہا تھا وہ سوشلسٹ اور مزدور تحریکیں تھیں۔اور وہ بڑی تیزی سے ابھرتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔1917ء میں روس کے اندر بالشویک انقلاب آ گیا اور سوویت یونین کی شکل میں انہوں نے بہت سے ایسے علاقوں میں بھی سوشلزم قائم کر دیا جو اس کا حصہ نہیں تھے۔یعنی کہ وہ یورپ کی طرف بڑھتے ہوئے نظر آ رہے تھے اور وہاں بہت بڑی تحریک موجود تھی۔اٹلی، جرمنی اور برطانیہ کے اندر بھی ہر جگہ مزدوروں اور کسانوں کی تحریکیں نظر آ رہی تھیں۔

انتونیو گرامچی جو کہ مزدوروں کا لیڈر تھا اور اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی کا رہنما تھا۔اس نے تجزیہ کیا ہے کہ اٹلی میں فاشزم کس طرح ابھرا۔سب سے پہلے فاشزم اٹلی میں ہی ابھرا اور اس کا مرکزی فلاسفر مسولینی تھا۔مسولینی نے اپنی تحریک شامل لوگوں کو کالی شرٹس پہنانا شروع کیں۔اگرچہ مسولینی پہلے سوشلسٹ پارٹی آف اٹلی کا لیڈر رہوا کرتا تھا۔وہ سوشلسٹوں سے اس بات پر خفا تھا کہ انہوں نے پہلی جنگ عظیم میں اٹلی کے حکمران طبقے کا ساتھ نہیں دیا بلکہ ان کی مخالفت کی۔اس بنیاد پر وہ ناراض ہوا اور اس نے سوشلسٹ پارٹی چھوڑی اور اپنی فاشسٹ پارٹی قائم کر لی۔اب اس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہم اٹلی کو عظیم بنائیں گے۔اس نے بلیک شرٹس تحریک کا آغاز کیا۔انہوں نے کالے کپڑے پہن لئے۔انہوں نے کہا کہ ہمارا سب سے بڑا دشمن کمیونزم اور سوشلزم ہے ہم سب سے پہلے اس کو ختم کریں گے۔انہوں نے مختلف ٹریڈ یونینز وغیرہ کو توڑنا شروع کر دیا۔یہ وہ دور تھا جب جنوبی اٹلی میں یونین بہت طاقتور ہو گئے تھے اور پورے پورے علاقوں پر مزدوروں نے قبضہ کر لیا تھا۔بلیک شرٹس نے غنڈے اور بدمعاش جمع کئے اور ان کو مارنا پیٹنا شروع کیا اور وہ علاقے اپنے کنٹرول میں لے لیے۔فوری طور پر جیسے ہی انہوں نے یہ کام کیا تو بڑے بڑے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے مسولینی کی بلیک شرٹ تحریک کو بے تحاشہ پیسے دینے شروع کیے اور ان کی حمایت کرنا شروع کی۔ان کے خیال میں یہ بہت اچھے لوگ تھے کیونکہ یہ مزدوروں کی تحریکوں کو، ٹریڈ یونینز کو، سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کو، ان سب لوگوں کو یعنی کہ بائیں بازو کے لوگوں کمزور کرتے ہیں۔یعنی کہ فاشزم کی جو پہلی بنیاد ہی دائیں بازو میں تھی اور وہ بائیں بازو کے خلاف تھے۔

اب مسولینی حکمران بن گیا اور اس کے خیالات جرمنی اور دوسرے ملکوں میں پھیلنا شروع ہو گئے۔جرمنی میں بھی پہلی جنگ عظیم کی

وجہ سے بہت بڑا بحران تھا۔ وہاں ایک لبرل حکومت قائم تھی جس کا نام وائیمار ری پبلک تھا۔ اس کے خلاف ایڈوولف ہٹلر نے اپنی پارٹی بنائی جس کا نام سوشلسٹ جرمن ورکرز پارٹی تھا۔ آپ حیران ہوں گے کہ پارٹی کے نام میں تو سوشلسٹ بھی ہے اس میں ورکرز کا بھی ذکر ہے۔ جس کو مختصر طور پر نازی پارٹی کہتے ہیں۔ اس میں سوشلسٹ اور ورکرز کا ذکر کیوں؟ یہ اس لیے تھا کیونکہ یہ مزدوروں میں گھس کے مزدوروں کی تنظیموں کو توڑتے تھے بالکل اسی طرح جیسے مسولینی نے اٹلی میں کیا۔ مسولینی کی تحریک بلیک شرٹس تھی ان کی تحریک براؤن شرٹس تھی۔ یہ بھی مزدوروں کی تنظیموں میں گھس کے ان کو توڑتے تھے۔ ان کو بھی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں نے بڑا سپورٹ کیا۔

1933ء میں ہٹلر اگرچہ الیکشن نہ جیت سکا لیکن پارلیمنٹ میں آ گیا۔ اس کے پاس تقریباً 30 فیصد ووٹ تھے۔ وائیمار ری پبلک کے چانسلر نے اقتدار چھوڑتے وقت آہستہ آہستہ ہٹلر کو اختیارات دینا شروع کر دیے۔ اسی دوران پارلیمنٹ پر اچانک حملہ ہوا اور اسے آگ لگ گئی۔ ہٹلر نے فوری طور پر اس کا الزام جرمنی کی کمیونسٹ پارٹی پر لگایا۔ اس نے پارلیمنٹ کو ختم کر دیا۔ جرمنی کی کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگا دی اور تمام اپوزیشن کو بشمول لبرلز اور ڈیموکریٹس کے، ختم کر دیا۔ ہٹلر نے پبلک پرائیویٹ تفریق کو ختم کرتے ہوئے کہا کہ اب ہم جنگ کے لیے تیاری کریں گے۔ اس نے صنعتوں پر قبضہ کر کے کسی حد تک منصوبہ بند معیشت قائم کی لیکن یہ بھی سرمایہ داروں کے مفادات اور حق میں تھی۔ اس نے کہا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم پورے مشرقی یورپ اور پورے یورپ میں پھیل جائیں اور ہم اپنی حکومت قائم کریں۔ ہٹلر کو شروع میں بہت تیزی سے کامیابی ملی۔ بلکہ آسٹرو ہنگیرین سلطنت نے تو خود ہی کہہ دیا کہ ہم بھی فاشسٹ ہیں اور آپ کے ساتھ ہیں۔ بہت سارے دوسرے لوگوں نے بھی خاص طور پر بادشاہتوں اور جاگیردار طبقہ نے ہٹلر کی حمایت کرنا شروع کر دی۔ اس طرح فاشسٹ تحریک پورے یورپ میں پھیل گئی اور قائم ہو گئی۔ شروع میں لبرلز کا رویہ فاشزم کی جانب لاتعلقی کا تھا وہ ان سے بالکل نہیں لڑنا چاہتے تھے۔ بائیں بازو کے لوگ لڑنا چاہتے تھے لیکن لبرلز کا رویہ فاشزم کی جانب طمانیت والا تھا۔

اس سے فاشسٹ مضبوط سے مضبوط تر ہوتے جا رہے تھے۔ آخر کار ہٹلر نے اپنی فوج بھی دوسرے ملک میں بھیجنا شروع کر دی۔ اس نے چیکوسلواکیہ کے جرمن حصے پر قبضہ کیا۔ پولینڈ سے بھی جرمن حصہ لیا۔ پھر اس نے یورپ کے اندر اپنی فوجیں پھیلانا شروع کر دیں۔ اس نے فرانس پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس نے برطانیہ پر حملہ کر دیا۔ ابھی برطانیہ کو مکمل شکست نہیں ہوئی تھی کہ اس نے سوویت یونین پر حملہ کر دیا۔ یہ دنیا کی تاریخ کی سب سے بڑی جنگ تھی جس میں 5 کروڑ لوگ مارے گئے۔ مگر آخر میں کامیابی سوویت یونین اور اتحادیوں کو ہوئی۔ کیوں کہ سوویت یونین نے جرمنی اور فرانس میں ہٹلر کے خلاف مزاحمت کرنے والے لوگوں کے ساتھ معاہدہ کر لیا اور انہوں نے اکٹھے فاشزم کے خلاف لڑائی کی۔ فاشزم کو آخر کار شکست ہوئی اگرچہ اس میں پانچ کروڑ افراد مارے گئے جو بہت بڑی تعداد ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد جب یورپ میں اتفاق رائے قائم ہوا اور لوگوں نے یہ سمجھا کہ فاشزم بہت بری چیز ہے اور آئندہ کبھی بھی فاشسٹوں کو اقتدار میں نہیں آنے دیں گے۔ اس کو بڑھنے نہیں دیں گے اور کسی مخالف کو یہ کہنا کہ تم فاشسٹ ہو بہت بڑی گالی بن گیا۔ ایک بہت بڑی تہمت بن گیا اس کی وجہ بنیادی طور پر یہ تھی کہ تمام لوگوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ فاشزم کے نتیجے میں دوسری عالمی جنگ ہوئی اور پانچ کروڑ لوگوں کا قتل عام ہوا۔ فاشزم کو تباہ کرنے کے لئے سوشلزم اور لبرل جمہوریت کو جو کامیابیاں ہوئیں اس کے لئے بے

تحاشہ قربانیاں دینی پڑیں۔دوسری عالمی جنگ کے اختتام کے بعد سرد جنگ شروع ہوگئی۔جس میں لبرلز اور سوشلسٹوں کی لڑائی ہوئی۔فاشسٹ اب ایک طاقت کے طور پر ختم ہو چکے تھے۔

آخر میں اس کا خلاصہ پیش کروں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ فاشزم ایک دائیں بازو کی تحریک ہے۔جو کہ نیشنلزم کے نام پر ایک آمریت قائم کرنا چاہتی ہے۔۔اس کا سب سے بڑا مخالف بنیادی طور پر جس کے خلاف قائم ہوئی وہ سوشلزم تھا۔لبرلز نے ان کے خلاف ہمدردانہ کردار ادا کیا لیکن فاشسٹ لبرلز کے بھی خلاف ہو گئے۔لبرلز اور سوشلسٹ بنیادی طور پر دونوں فاشزم کی زد میں تھے۔تیسری اور سب سے اہم بات یہ کہ فاشزم کا طبقاتی کردار یہ تھا کہ وہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی ایک تحریک تھی اور اس کا مقصد یہی تھا کہ جمہوریت کو بھی ختم کردو اور خاص طور پر ٹریڈ یونینز اور سوشلسٹ تحریکیں ختم کردو۔کیونکہ کہیں جمہوریت کے ذریعے بائیں بازو کے لوگ یعنی کہ سوشلسٹ اقتدار میں نہ آجائیں۔اس سے سرمایہ داری نظام کو اور جاگیرداری کو خطرہ ہے۔

مارکسزم کیا ہے؟

آج میری کوشش یہ ہے کہ میں آپ کو کارل مارکس کی جدلیاتی مادیت سکھاؤں۔ یہ تھوڑا مشکل فلسفہ ہے اس کو سمجھنے میں کچھ ٹائم لگتا ہے۔ میں آج اس کو مختصر طور پر بیان کروں گا۔ اس کے بعد مزید وی لاگز میں اس کی وضاحت کرتا رہوں گا۔ جدلیاتی مادیت دو لفظوں سے بنا ہے۔ جدل یعنی کہ تضاد اور مادیت سے مراد دنیا کو مادی انداز میں پرکھنا ہے۔ کارل مارکس نے اپنا فلسفہ ہیگل کے فلسفے سے اخذ کیا۔ ہیگل نے جو بنیادی نقطہ نظر بیان کیا وہ یہ تھا کہ انسانی تاریخ ایک جدلیاتی طریقے سے چل رہی ہے۔ اس جدلیاتی طریقے کی بنیاد ہمارے تصورات ہیں۔ مارکس نے بنیادی طور پر اس کو الٹا دیا۔ اس نے یہ کہا کہ مادی دنیا تصورات کے پیچھے نہیں چل رہی بلکہ الٹ ہے۔ مادی دنیا کا جوارتقا ہے اسی کی بنیاد پر ہمارے تصورات پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ کال مارکس بنیادی طور پر مادیت پسند تھا۔ اس سے مراد ہے کہ ایسا فلسفی جو یہ سمجھے کہ مادے کے علاوہ دنیا میں کوئی اور چیز نہیں ہے۔ کوئی روحانی چیز نہیں ہے۔ انسانی تصورات بھی دراصل ایک مادی چیز یعنی کہ انسانی دماغ کے عمل کا نتیجہ ہیں۔

جب کارل مارکس نے ہیگل کے فلسفے کو الٹا دیا تو اس نے سمجھایا کے جدلیاتی ارتقاء تصورات کی بنیاد پر نہیں ہو رہا بلکہ یہ ہماری محنت کے نتیجے میں ہو رہا ہے۔ کیونکہ انسان کے زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ محنت کرے اور جب انسان محنت کرتا ہے تو ظاہر ہے اسے ایک دوسرے سے رشتے قائم کرنا پڑتے ہیں۔ مزید یہ کہ زندگی کو آگے بڑھانے کے لیے بھی رشتہ جوڑنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر میاں بیوی کا یا مرد اور عورت کا رشتہ۔ گویا انسان کے دو رشتے اس کے سماج کی بنیاد رکھتے ہیں۔ پہلا یہ کے نسل انسانی کو آگے بڑھانے کے لئے اس کے رشتے ہیں اور دوسرا پیداواری عمل کے رشتے ہیں۔ کارل مارکس یہ کہتا ہے کہ یہ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے سے جڑے رہتے ہیں۔ جو پیداواری رشتے قائم کیے جاتے ہیں یہ اپنی مرضی سے قائم نہیں کئے جاسکتے۔ یہ صرف اور صرف مادی حالات کی بنیاد پر ہی قائم ہوتے ہیں۔ قدیم انسانی تاریخ میں شکاری معاشرے کے پیداواری تعلقات قائم ہوں گے، جدید معاشرے میں اس سے مختلف پیداواری رشتے قائم ہوں گے۔ اس طرح سے ہمارے پاس دو اصطلاحات آجاتی ہیں۔ ایک ہے پیداواری رشتے اور دوسری ہے پیداواری قوتیں۔ پیداواری قوتوں سے ہماری مراد یہ ہے کہ وہ ٹیکنالوجی جو کسی سوسائٹی کے پاس موجود ہے۔ مثلاً آیا وہ شکاری معاشرہ ہے؟ وہ زراعت جانتا ہے یا نہیں؟ یا انہیں جدید صنعت کا علم ہے یا نہیں ہے۔ پیداواری قوتوں اور پیداواری رشتوں کا جو تضاد ہے اس کے نتیجے میں تاریخ آگے بڑھتی ہے۔

ان پیداواری رشتوں اور ان پیداواری قوتوں کو ہم ایک نظام میں دیکھیں تو اسے ہم کہیں گے طرز پیداوار۔ اس کو مزید آسان آپ کرنا چاہیں تو طرز پیداوار کو آپ معاشی نظام بھی کہہ سکتے ہیں۔ معاشی نظام کے دو پہلو ہوئے ایک ہے ذرائع پیداوار اور دوسرا ہے محنت۔ وہ تمام چیزیں جو محنت نہیں ہیں وہ ذرائع پیداوار میں شامل ہو جاتی ہیں۔ یعنی وہ تمام چیزیں جن سے ہم مزید چیزیں بنا سکتے ہیں۔ اس میں اوزار بھی شامل ہیں، اس میں وہ خام مال بھی شامل ہے جو ہم استعمال کرتے ہیں۔

آخر میں کارل مارکس ایک اور تصور دیتا ہے جسے بیگانگی کا تصور کہتے ہیں۔ بیگانگی سے مراد اس کی یہ ہے کہ اگر میں کوئی ایک چیز بناؤں اور وہ چیز میری نہ ہو، تو وہ چیز میرے سے الگ اور دور ہے، مجھ سے بیگانہ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ میری تخلیقی قوت میرے کنٹرول میں نہیں رہتی اس سے بیگانگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ محنت کشوں کی بیگانگی ہے۔ جب معاشرے میں مہارت موجود ہوتی ہے تو بیگانگی بھی ہوتی ہے۔ پہلے ہم بیگانگی پر بات کرتے ہیں۔ جب میری اپنی محنت سے بنائی ہوئی چیز میرے قابو میں نہ ہو تو اس کا مطلب ہے کہ میری تخلیقی صلاحیت مجھ سے بیگانہ کی جارہی ہے۔

اب جدلیاتی تاریخ کو سمجھتے ہیں۔ پیداواری رشتوں اور پیداواری قوتوں جو میں نے آپ کو بتایا تھا، ان کے درمیان ہمیشہ تنازع رہتا ہے۔ مثال کے طور پر پیداواری رشتے قائم ہوئے پیداواری قوتوں کی بنیاد پر۔ پیداواری رشتوں نے آہستہ آہستہ پیداواری قوتوں یعنی کہ ٹیکنالوجی کو آگے بڑھایا۔ اس کو آسان زبان میں میں یہ کہوں گا کہ معاشی نظام کے نتیجے میں آہستہ آہستہ ٹیکنالوجی نے ترقی کی۔ کسی نہ کسی نقطے پر ٹیکنالوجی کا ارتقا اتنا زیادہ ہوجاتا ہے کہ وہ نظام نہ صرف ٹیکنالوجی کو مزید ترقی نہیں دے سکتا ہے بلکہ اس کی ترقی میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اسے ہم کال مارکس کی زبان میں یہ کہتے ہیں کہ پیداواری رشتوں اور تعلقات میں تضاد پیدا ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد ایسا گمان ہوتا ہے کہ اگر سوسائٹی نے مزید ارتقاء کرنا ہے تو اس کو اپنا معاشی نظام تبدیل کرنا پڑے گا۔ کبھی کبھار سوسائٹی جامد ہوجاتی ہے اور کبھی کبھار تنزلی کا شکار بھی ہوجاتی ہے۔ لیکن آگے بڑھنے کے لیے معاشی نظام کی تبدیلی ضروری ہوتی ہے۔ اس کو اپنا طرز پیداوار تبدیل کرنا ہوتا ہے اور طرز پیداوار کا مطلب ہے پیداواری رشتے۔ جب پیداواری رشتے تبدیل ہوں گے تو پھر پیداواری قوتیں مزید آگے بڑھ سکیں گی۔ آسان زبان میں یہ کہ ایک معاشی نظام ہوتا ہے اور یہ معاشی نظام کسی فرد کی ذہن کی ایجاد نہیں ہوتا بلکہ ضروریات کے حساب سے بنایا جاتا ہے۔ معاشی نظام میں سماج ترقی کرتا ہے۔ ایک خاص نقطے کے بعد سماج مزید ترقی نہیں کرسکتا۔ یہ معاشی نظام پرانا ہوجاتا ہے۔ اس کے خلاف ایک پورا سماجی انقلاب ہوتا ہے۔ اس سماجی انقلاب کے پاس ایک نیا معاشی نظام پیداوار ہوتا ہے۔ اور اس نئے معاشی نظام میں ترقی کا پہیہ پھر آگے کی طرف چلنا شروع ہوجاتا ہے۔ اس تبدیلی کو، اس راستے کو اور اس کے ارتقاء کو کارل مارکس تاریخی جدلیات کہتا ہے۔ پیداوار اور پیداواری قوتوں کے درمیان تضاد تاریخی جدلیات ہے۔ اس کے نتیجے میں طبقاتی جدوجہد پیدا ہوتی ہے۔

طبقات کیا ہوتے ہیں؟ معاشرہ طبقات میں بٹا ہوا ہے۔ جس کے قبضے میں ذرائع پیداوار ہوتے ہوں وہ ایک طبقہ ہوتا ہے جب کہ جو ذرائع پیداوار سے محروم ہوتے ہیں وہ دوسرے طبقے میں ہوتے ہیں۔ یعنی ذرائع پیداوار سے رشتہ ہی آپ کے طبقے کو متعین کرتا ہے۔ ہیگل کہتا ہے کہ افراد کا ایسا گروپ جس کے ذرائع پیداوار سے ایک جیسے تعلقات ہوں وہ ایک طبقہ کہلاتا ہے۔ ہر معاشرے میں ایک ایسا طبقہ ہوتا ہے جو معاشی وسائل کو کنٹرول کرتا ہے اور ایک ایسا طبقہ ہوتا ہے جو معاشی وسائل کو کنٹرول نہیں کرتا۔ جو طبقہ ذرائع پیداوار کو کنٹرول کرتا ہے دراصل وہی معاشرے کو بھی کنٹرول کرتا ہے۔ کارل مارکس کی تعلیمات کی تفہیم کے لیے یہ بنیادی نقطہ ہے کہ جو طبقہ معاشرے کے ذرائع پیداوار پر قابض ہے دراصل وہی معاشرے کا حاکم طبقہ ہوتا ہے۔ ان دونوں طبقات کا آپس میں تضاد ہوتا ہے اور ان کی ایک دوسرے کے خلاف جدوجہد ہوتی ہے۔ جو محروم طبقات ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ہم ذرائع پیداوار پر قبضہ کرلیں اور جو حاکم طبقہ ہے وہ

چاہتا ہے کہ ہم اپنا قبضہ ذرائع پیداوار پر برقرار رکھیں۔اس لئے تاریخ میں ہمیں طبقاتی جدوجہد نظر آتی ہے۔انقلاب بنیادی طور پر یہی چیز ہے کہ محروم طبقات حاکم طبقات کا ذرائع پیداوار پر سے قبضہ ختم کر دیتے ہیں اور اس پر قابض ہو جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ایک نیا معاشی نظام پیدا ہو جاتا ہے۔یعنی کہ وہ جو تعلقات تھے وہ جو کشمکش تھی، پیداواری رشتوں اور تعلقات کے درمیان تضاد تھا، اس کا سیاسی زندگی میں جو اثر نظر آتا ہے وہ اس طبقاتی جدوجہد کی شکل میں نظر آتا ہے۔طبقاتی جدوجہد ہی کے نتیجے میں ساری سیاست، کلچر اور نظریات وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔

ہر طبقہ یہ کوشش کرتا ہے کہ اس کا نقطہ نظر اور اس کے مفادات معاشرے کے عام مفادات کے طور پر مانے جائیں۔اگر سرمایہ دار طبقہ ہے تو وہ کہے گا کہ سب لوگ سرمایہ داری نظام کو اپنائیں اور کہیں کہ سرمایہ داری نظام اچھا ہے اور سرمایہ داری نظام ہی کے نتیجے میں معاشرے میں ترقی ہوگی۔اگر کوئی جاگیردار ہے تو وہ یہ کہے گا کہ جاگیرداری نظام بہت اچھا ہے وغیرہ وغیرہ۔اگر کوئی مزدور ہے تو وہ کہے گا کہ مزدور راج یا سوشلزم بہت اچھا ہے۔عام طور پر ہر طبقہ چاہتا ہے کہ اس کے مفادات کا تحفظ ہو اور اس کو اپنے طبقاتی مفادات معاشرے کے عام مفادات کے طور پر پیش کرنا پڑتے ہیں تاکہ وہ مخالفین کے خلاف سیاسی لڑائی جیت سکے۔ہر طبقہ جب اپنی ریاست قائم کرتا ہے۔ریاست دراصل ہے ہی طبقاتی حکمرانی کا نام۔اس کو کارل مارکس کہتا ہے کہ یہ ڈکٹیٹرشپ ہوتی ہے۔ہر ریاست ڈکٹیٹرشپ ہوتی ہے۔وہ کہتا ہے کہ فوجی آمریت یا جمہوریت بنیادی طور پر سرمایہ داروں کی ڈکٹیٹرشپ ہے۔اسی طرح سے سوشلزم کی بھی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں۔اس کی جو بھی شکل ہو وہ مزدوروں یعنی عوام کی اکثریت کی ڈکٹیٹرشپ ہوتی ہے۔اور یہ ڈکٹیٹرشپ سرمایہ داروں کے خلاف ہوتی ہے۔سرمایہ داروں کی ڈکٹیٹرشپ کس کے خلاف ہوتی ہے؟ یہ مزدوروں کے خلاف ہوتی ہے۔اس کے نتیجے میں معاشرے اور سیاست میں نظریاتی جدوجہد نظر آتی ہے۔ہر طبقہ یہ چاہتا ہے کہ وہ حاکم بنے اور اس کا نقطہ نظر قبول ہو۔

ہمارے ہی نقطہ نظر کو تسلط حاصل ہو۔کسی بھی زمانے کا غالب نقطہ نظر حاکم طبقہ کا ہی ہوتا ہے اور وہ اس کی حاکمیت کا ہی نقطہ نظر ہوتا ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرے اور تاریخ کا طبقاتی جدوجہد کے نتیجے میں آہستہ آہستہ ارتقاء ہوتا ہے۔کارل مارکس ہمیں یہ بتاتا ہے کہ معاشرے کو ہم کم از کم پانچ زمانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ایک قدیم کمیونزم، اس کے بعد ایشیائی طرز پیداوار، پھر قدیم معاشرہ، اس کے بعد فیوڈلزم اور پھر موجودہ زمانے کا نظام یعنی کہ سرمایہ دارانہ نظام۔آیئے ایک ایک کر کے مختصر طور پر ان کو دیکھتے ہیں۔سب سے پہلا زمانہ شہری زندگی سے پہلے کا ہے۔کارل مارکس اسے قدیم کمیونزم کا نام دیتا ہے۔یہ زمانہ ہے جب ہم کاشتکاری نہیں جانتے تھے اور زیادہ تر شکار سے گزارہ ہوتا تھا۔اس دور کے اندر کسی قسم کی کوئی ملکیت تو نہیں تھی۔نہ ہی مردوں کو عورتوں پر فوقیت حاصل تھی اور نہ عورتوں کو مردوں پر فوقیت تھی۔نہ کوئی حاکم طبقہ تھا اور نہ کوئی محکوم طبقہ تھا۔نہ کوئی استحصال تھا اور نہ کوئی ریاست تھی۔جب زرعی انقلاب ہوتا ہے تو پہلی مرتبہ انسان کی پیداوار اس کی ضرورت سے زیادہ ہو جاتی ہے اور زائد پیداوار کو کچھ لوگ اپنے کنٹرول میں لے لیتے ہیں اور وہ حکمران طبقہ بن جاتے ہیں۔جب تک زائد پیداوار نہیں تھی حکمران طبقہ حکمران طبقہ نہیں بن سکتا تھا۔کیونکہ کوئی ایسی پیداوار ہی نہیں تھی جو زائد ہو۔جس کی بنیاد پر وہ حکمران بن سکے۔حکمران طبقے کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ طبقہ جو اپنی محنت پر نہیں کسی اور کی محنت پر رہتا ہو۔غذائی پیداوار کو محفوظ

رکھنے کے لئے اوراس کو بڑھانے کے لئے اورمزید لوگوں کو اپنی حاکمیت میں لینے کے لئے حکمران طبقے نے پہلی ریاستیں بنائیں۔

ریاست کا مطلب ہی ایسی تنظیم ہے جو مسلح ہو اور پیداواری کام کرنے والوں سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔اسے آپ فوج کہہ سکتے ہیں اور یہ کسی بھی ریاست کا بنیادی ادارہ ہے۔اس کے بغیر ریاست قائم نہیں ہو۔اس ادارے کو قائم رکھنے کے لیے آپ کو ٹیکسز وغیرہ لینے پڑتے ہیں اوران ٹیکسز کے نتیجے میں بیوروکریسی پیدا ہوتی ہے۔ان دو بنیادی اداروں سے ریاست کے دیگر ادارے آہستہ آہستہ نکلتے ہیں۔

پھر زرعی انقلاب ہوا۔یہ انقلاب چین،انڈیا،بیبلون،ایران،اور مصر میں ہوا۔خاص طور پر مشرق وسطی کے اندر جو زرخیز خطہ مصر سے شروع ہو کر شام تک جاتا ہے اور شام سے عراق تک آتے ہوئے ایک پوری پٹی بنتی ہے یہیں بنیادی طور پر پہلی تہذیب قائم ہوئی۔پہلی ریاست شاہد بیبلون کی قائم ہوئی۔اس کے چین کی تہذیب،مصر کی تہذیب اور وادی سندھ کی تہذیب وغیرہ آتے ہیں۔یہ ساری تہذیبیں دریا کے اردگرد ہوا کرتی تھی۔جب یہ ساری تہذیبیں قائم ہوئیں تو پہلی دفعہ ملکیت کا تصور سامنے آیا۔ملکیت کا جو تصور ہندوستان کے اور ایشیا اس میں ایک قبیلہ معاشی ذرائع کو کنٹرول کرتا تھا۔دوسرا قبیلہ اس کا ماتحت ہوتا تھا۔ہندوستان میں جب یہ وراثتی بن گیا تو اس کو ذات پات کا نظام کہا جانے لگا۔

تاریخ کا دوسرا دور قدیم معاشرہ کہلاتا ہے۔چھٹی صدی قبل مسیح سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔اور اس کا خاتمہ اس وقت ہوتا ہے جب پانچویں صدی عیسوی میں روم کی سلطنت کا شیرازہ ہے۔اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بنیاد غلامی پر تھی۔ paganism اس کی بنیادی خصوصیت تھی۔اسی دور کے اندر پدرسری نظام پیدا ہوا۔اس دور میں عورت پر مرد کی حاکمیت قائم ہوئی۔اس کا اعلی ترین شکل میں ارتقاء روم میں ہوا۔

روم کی سلطنت کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد فیوڈل معاشروں کا آغاز ہوتا ہے اور اس کا آغاز پانچویں صدی سے ہی ہوتا ہے جب رومن سلطنت بکھری تھی۔یہ سرمایہ دارانہ نظام آنے تک قائم رہتا ہے اور یہ یورپ کا نظام ہے۔کارل مارکس یہ نہیں سمجھتا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان میں فیوڈل نظام ہے۔کارل مارکس کے خیال میں ہندوستان،پاکستان اور چین میں بنیادی طور پر ایشیائی طرز پیداوار تھا اسے ہم فیوڈلزم نہیں کہہ سکتے۔کلاسیکل فیوڈلزم فرانس میں پایا جاتا تھا یہ اس کا مرکزی علاقہ تھا۔اٹلی میں بھی یہ پایا جاتا تھا۔اس کا بنیادی ادارہ سرف ڈم ہے۔سرف میں یہ ہوتا تھا کہ کسان بادشاہ کے ہاتھ پر بیعت کر لیتا تھا کہ میں آپ کو اپنی فصل دوں گا اور آپ نے میری حفاظت کرنی ہے۔یہ جو کرائے کا تعلق پیدا ہوا یہ بنیادی طور پر سرف ڈم کا تعلق تھا۔اس میں طبقات پیدا ہوئے ان میں ایک طرف لینڈ لارڈ تھا اور دوسری طرف سرف تھا۔ایک طرف گرینڈ ماسٹر تھا دوسری جانب جینی مین یا اپرنٹس تھا۔شہروں میں گلڈ ماسٹر یعنی کہ استاد اور شاگرد کا رشتہ تھا۔جبکہ دیہاتوں میں فیوڈل لارڈ اور سرف کا رشتہ تھا۔یہ وہ زمانہ ہے جب نظریاتی طور پر مسیحیت کا غلبہ تھا۔

سولہویں صدی کے بعد سرمایہ دارانہ نظام آتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا پر چھا جاتا ہے۔یہ وہ پہلا نظام ہے جو کہ عالمی ہے۔فیوڈلزم کو کارل مارکس پوری دنیا کا نظام نہیں سمجھتا تھا۔نہ قدیم معاشروں کو اور نہ ایشیائی طرز پیداوار کو۔سرمایہ داری نظام پہلا وہ نظام

ہے جس نے ایک عالمی منڈی قائم کی۔اس کی بنیاد ایک جانب دیہاڑی دار یا اجرتی مزدور ہے اور دوسری طرف سرمایہ ہے۔کارل مارکس کے نزدیک سرمایہ پیسے کا نام نہیں ہے اور نہ ہی یہ مشینوں کا نام ہے۔سرمایہ ایک سماجی تعلق کا نام ہے جہاں پر اجرتی محنت کا نظام قائم ہوتا ہے وہاں پر سرمایہ قائم ہوتا ہے۔جہاں پر دیہاڑی دار مزدور ہوگا وہیں پر سرمایہ قائم ہوگا۔یہ کس طرح سے ممکن ہے؟ یہ میں داس کیپیٹل وغیرہ کے لیکچرز میں آپ کو سمجھاؤں گا فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔اس میں ہوتا یہ ہے کہ مزدور جو محنت کرتا ہے اس کو اپنی محنت کا صلہ پورا نہیں ملتا۔محنت سے وہ خود کوری پروڈیوس کرسکتا ہے لیکن جو چیز وہ پیدا کرتا ہے وہ اس رقم سے بہت زیادہ ہوتی ہے جو اس کی ری پروڈکشن کے لیے درکار ہوتی ہے۔ان دونوں چیزوں میں فرق قدر زائد کہلاتا ہے اور قدر زائد سرمایہ دار کے کنٹرول میں ہوتی ہے۔سرمایہ دار پہلے تو ایک دوسرے سے بہت مقابلے میں رہتے ہیں۔مقابلہ اور پیداوار آگے بڑھتا ہے۔لیکن جیسے جیسے مقابلہ آگے بڑھتا ہے تو مقابلہ جیتنے والے اجارہ دار بن جاتے ہیں۔جیسے جیسے ان کی اپنی اجارہ داری قائم ہوجاتی ہے تو اس سرمایہ داری نظام کا جو اپنا تحرک ہے وہ ٹوٹتا چلا جاتا ہے وہ پھنستا چلا جاتا ہے۔کیوں کہ اجارہ داری قائم ہوجاتی ہے اور اجارہ داری میں آگے بڑھنے کے لیے کوئی انسینٹیو نہیں ہوتا۔آہستہ آہستہ اجارہ داری کے نتیجے میں یہ چیزیں جامد ہوجاتی ہیں۔دوسرا یہ کہ سرمایہ داری نظام میں امیر اور غریب کے درمیان فرق بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔کارل مارکس کہتا ہے کہ پھر ایک وقت ایسا آئے گا جب مزدور طبقہ اکٹھا ہو کے سرمایہ داری نظام کو اکھاڑ پھینکے گا۔جب سرمایہ داری نظام ختم ہوگا تو کارل مارکس کہتا ہے کہ سوشلزم کا دور شروع ہوگا۔

اس کی خاصیت یہ ہے کہ یہ اجتماعی جائداد اور ملکیت پر بنیاد رکھے گا۔کیونکہ مزدور طبقہ جو اجتماعی طور پر محنت کرتا ہے کیونکہ وہ غیر ملکیتی طبقہ ہے۔جب یہ غیر ملکیتی طبقہ ملکیتی طبقات کے خلاف بغاوت کرے گا تو وہ ملکیت کے خاتمے کے لیے بغاوت کرے گا۔کیونکہ وہ تاریخ میں ایسا منفرد طبقہ ہے جس کے پاس کوئی ملکیت نہیں ہے۔جب وہ بغاوت کرتا ہے تو وہ اس وجہ سے بغاوت نہیں کرتا کہ وہ مالکوں کی جگہ خود مالک بن جائے بلکہ ان کی بغاوت یا انقلاب بنیادی طور پر ملکیت کے بنیادی تصور ہی کے خلاف ہوتا ہے۔وہ نجی ملکیت کے خلاف ہوتا ہے۔اس کے نتیجے میں اجتماعی ملکیت قائم ہوجاتی ہے۔اس میں غالب طبقہ مزدور طبقہ خود بن جائے گا۔اس محنت کش طبقے میں صنعتی مزدور یعنی محنت کرنے والے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ صرف ہاتھ سے محنت کرنے والے، ذہنی محنت کرنے والے بھی شامل ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ یہ نظام کمیونزم میں تبدیل ہوجائے گا۔

پہلے قدیم کمیونزم کا ذکر ہوا ہے لیکن اب ترقی یافتہ کمیونزم پیدا ہوگا۔قدیم کمیونزم تو یہ تھا کہ ہمارے پاس اتنی ٹیکنالوجی ہی نہیں تھی کہ ہم زائد پیداوار کرسکیں۔لہذا کوئی حکمران طبقہ تھا ہی نہیں۔پھر ہمارے پاس اتنی ٹیکنالوجی آگئی کہ ہم نے زائد پیداوار کرنی شروع کر دی۔پھر اس کے بعد پورا ایک دور گزرا جس میں حاکم طبقہ قائم رہا۔اس کے بعد پھر ہمیں اتنی عقل آجائے گی اور پرولتاری یا عوام جب اقتدار حاصل کرلے گی تو ہم یہ کہیں گے کہ زائد پیداوار ایک چھوٹے سے طبقے کے لیے استعمال نہیں ہونی چاہئے بلکہ لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال ہونی چاہیے اور اور مزید ترقی کے لیے استعمال ہونی چاہئے۔یہ محض چند سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے لئے استعمال نہیں ہونی چاہئے بلکہ تمام عوام کے لیے استعمال ہونی چاہئے۔تاریخ کا یہ دور ایسا ہوگا جس کے اندر ریاست کی بھی ضرورت نہیں

ہوگی۔ ریاست کا جو پہلا مقصد تھا وہ زائد پیداوار پر کسی طبقے کی اجارہ داری قائم رکھنا وہ باقی نہیں رہے گا اس لئے ریاست کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔ پدرسری بھی اسی دور کے اندر ختم ہوگا کیونکہ پدرسری کی بنیادی ہی ملکیت ہے۔ ملکیت کے نتیجے میں ہی پدرسری پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال ختم ہو جائے گا۔

کیا اس کا مطلب ہے کہ کوئی یوٹوپیا قائم ہو جائے گا جس میں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا اور کوئی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرے گا؟ ہرگز نہیں۔ کارل مارکس کہتا ہے کہ انسانی تاریخ کا ایک دور اور اس دور سے متعلق مسائل ختم ہو جائیں گے۔ اس طرح ہیگل نے کہا تاریخ کا اختتام نہیں ہوگا بلکہ انسان کی ایک نئی تاریخ کا آغاز ہوگا جس میں نئی قسم کے تضادات ہوں گے۔ کیا تضادات ہوں گے؟ جب آپ پہنچیں گے تو پتہ چلے گا کہ کیا تضادات ہوں گے۔ ہیگل کہتا ہے کہ تصور کی بنیاد پر تاریخ ایک جدلیاتی راستہ اختیار کر رہی ہے کارل مارکس اس کو الٹا کے اس کی مادی بنیاد قائم کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بالکل جدلیاتی انداز میں تاریخ کا ارتقا ہو رہا ہے۔ لیکن یہ جدلیات محنت کشوں کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ انسان محنت کے عمل میں ایک دوسرے کے ساتھ سماجی رشتہ قائم کرتے ہیں۔ وہ سماجی رشتے ایک معاشی نظام قائم کرتے ہیں۔ وہ معاشی نظام ایک حد تک سماج کی ترقی کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ معاشی نظام سماج کی ترقی کو روک دیتا ہے۔ مزید سماجی ترقی کے لیے انقلاب برپا کرنا ضروری ہے تاکہ نیا معاشی نظام قائم ہو۔ اس انقلاب کو برپا کون کرتا ہے؟ طبقاتی جدوجہد اور طبقاتی آزاد کے نتیجے میں یہ انقلاب برپا ہوتا ہے۔ چنانچہ تاریخ کا پورا تسلسل جو ہمیں نظر آتا ہے جس میں قدیم کمیونزم، ایشیائی طرز پیداوار، فیوڈل ازم، سرمایہ داری، یہ ساری تبدیلیاں طبقاتی جدوجہد کے نتیجے میں ہوئی ہیں۔ بس ان میں بتدریج ملکیت کے تصور تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ معاشی نظام بدلتے رہے ہیں۔ حاکم سب کا تبدیل ہوتا رہا ہے تصورات تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ یہ جدلیاتی راستہ جو آپ کو نظر آ رہا ہے اس کی بنیاد انسانوں کی، اس معاشرے کے اندر بسنے والے لوگوں کی محنت ہے اور اسی محنت کے نتیجے میں آپس کے سماجی رشتے ہیں۔ ایک وقت ایسا ضرور آئے گا خاص طور پر سرمایہ داری نظام جب اجارہ داری شکل اختیار کر جائے گا اور محنت کش طبقہ اس کو اکھاڑ پھینکے گا۔ ملکیتی نظام کو ختم کرے گا اور کمیونزم کی اعلیٰ ترین شکل قائم کرے گا۔ اس طرح تاریخ کا ایک پورا جدلیاتی دور ختم ہوگا۔

جدلیات کیا ہوئی پہلے ہم نے ایسے معاشرے سے اس کا آغاز کیا جہاں پر کوئی ملکیت نہیں تھی۔ پھر ہم تاریخ کے ایسے دور میں جائیں گے جہاں ہر معاشرے کی بنیاد ملکیت پر ہے اور پھر ہم آخر کار ایسے دور میں داخل ہو جائیں گے جہاں پر ملکیت کا ایک مرتبہ پھر خاتمہ ہو جائے گا۔ اس کا نام ہے ترقی یافتہ کمیونزم۔ بنیادی طور پر یہی کارل مارکس کا فلسفہ ہے۔ اس میں میں نے بہت ساری باتیں کی ہیں۔ کئی نئی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ کئی نئے تصورات بھی پیش کیے ہیں۔ جن کو مجھے اتنی جلدی نہیں پیش کرنا چاہیے تھا لیکن ہم اب ان کو آہستہ آہستہ دوبارہ سے دیکھ سکتے ہیں۔

سیکولرزم کیا ہے؟

میرے طالب علم اکثر مجھ سے یہ سوال پوچھتے ہیں کہ سیکولرزم میں آخر ایسی کیا بات ہے کہ پاکستان میں اس پر اتنی بحث اتنی لڑائی اور اتنا فساد ہو رہا ہے؟ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں اسلام نافذ کر دیں سارے مسئلے حل ہو جائیں گے دوسری جانب وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ مذہب اور ریاست کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے۔ ریاست کا کوئی اپنا مذہب نہیں ہونا چاہئے۔ ریاست کو مذہب کی بنیاد پر کسی قسم کا امتیازی سلوک نہیں کرنا چاہئے یعنی ہمیں سیکولرزم کو نافذ کرنا چاہئے۔ اگر ہم سے سیکولرزم کو سیاسی طور پر نافذ کریں گے تو پاکستان کے اندر امن ہوگا اور سکون ہو جائے گا۔ پوچھا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں کے پاس کیا دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ سیکولرزم نافذ کرنے کے نتیجے میں امن قائم ہو جائے گا اور مسئلے حل ہو جائیں گے۔ اس کو سمجھنے کے لئے ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ حقیقت میں بھی کوئی ایسا ملک یا علاقہ ہے جہاں سیکولرازم کے نفاذ سے امن وامان قائم ہوا ہو۔ اس کی ہمارے پاس تاریخ بھی ہے اور مثالیں بھی ہیں۔

اگر ہم چودھویں صدی سے پہلے کے یورپ پر نظر ڈالیں تو پورے براعظم میں ایک ہی مذہب کا غلبہ نظر آتا ہے۔ یعنی وہاں پہ کیتھولک مذہب اکثریت میں ہے۔ رومن کیتھولک چرچ کو ماننے والے زیادہ تعداد میں ہیں۔ رومن کیتھولک چرچ قرون وسطی کے یورپ کا سب سے بڑا ادارہ تھا۔ اور اس کے قبضے میں تقریبا یورپ کی ایک تہائی زمین تھی۔ یہ بہت طاقتور ادارہ تھا اور یہ اتنا طاقتور تھا کہ اگر کوئی بادشاہ اس سے بغاوت کر رہا ہو اور وہ بادشاہ کے خلاف کوئی بیان جاری کرتے تو اس ملک کی رعایا بادشا کے خلاف بغاوت ہی کر دیتی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ہم چرچ کے ساتھ ہیں بادشاہ کے ساتھ نہیں ہے۔

اس سوچ کے خلاف سولہویں صدی میں بہت بڑا انقلاب برپا ہونا شروع ہوا۔ لوگ اس چرچ سے تنگ آ گئے۔ اس انقلاب کی رہنمائی مارٹن لوتھر نے کی۔ اس نے جب کیتھولک چرچ کے خلاف احتجاج کیا تو ان کا نام ہی پروٹسٹنٹ پڑ گیا یعنی وہ لوگ جو پروٹسٹ کریں۔ پروٹسٹنٹ ڈیفرمیشن جب شروع ہوئی تو اس کے نتیجے میں فوری طور پر لڑائی اور فسادات شروع ہو گئے۔ ایک طرف تو ڈیفرمیشن تھی دوسری طرف کاؤنٹر ڈیفرمیشن تھی۔ کیتھولک ڈیفرمیشن کو ختم کرنا چاہ رہے تھے۔ 1522ء میں دونوں کی جنگ شروع ہو گئی۔ یہ جنگ 1700ء تک چلی، یعنی 178 سال پروٹسٹنٹ اور کیتھولک آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے رہے اور پورے کے پورے یورپ میں لڑتے رہے۔ وسطی یورپ میں لڑتے رہے، مغربی یورپ میں لڑتے رہے، شمالی یورپ میں لڑتے رہے، پورے یورپ میں ان کی لڑائی ہوتی رہی۔ بلکہ ایک دور تو ایسا تھا کہ جنگ 1618ء میں شروع ہوئی اور 1648ء میں ختم ہوئی۔ کہا جاتا ہے کے اب تک یہ یورپ کی سب سے بڑی لڑائی تھی جس کے اندر سب سے زیادہ خون بہا اور جس کے اندر سب سے زیادہ تباہی ہوئی۔ بلکہ اس دور کے حوالے سے سوچیں جب یورپ کے اندر 80 لاکھ آبادی اس جنگ کے اندر تباہ و برباد ہو گئی۔ یہ بہت بڑی جنگ تھی۔ اس جنگ کے اندر لڑ لڑ کر حالات خراب ہو

گئے اوراس دور میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ جب یہ لڑائی اس نہج پر پہنچ گئی تو آخر کار یہ خود ہی تھک گئے اور یورپ کی کچھ طاقتوں نے یہ فیصلہ کیا کہ آؤ بیٹھ کر ہم ایک معاہدہ کریں۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو کہ کیتھولک ممالک تھے دوسری جانب وہ لوگ تھے جو پروٹسٹنٹ ازم کے ساتھ جڑے ہوئے تھے ان میں سویڈن، ڈنمارک، ہالینڈ اور حتٰی کہ فرانس بھی شامل تھا۔ حالانکہ خود فرانس کیتھولک تھا مگر پروٹسٹنٹس کے ساتھ شامل ہو گیا تھا کیونکہ اس کی اسپین سے لڑائی تھی۔

اس 30 سالہ جنگ کے بعد انہوں نے معاہدہ کیا۔ حالانکہ مختلف لڑائیاں تو 178 سال تک چلتی رہیں۔ اس معاہدے کو ٹریٹی آف ویسٹ فیلیا کہتے ہیں، اس میں انہوں نے دو چیزوں کا فیصلہ کیا ایک فیصلہ تو انہوں نے یہ کیا کہ ہم ایک دوسرے کی ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے۔ دوسرے ملک میں کیا ہو رہا ہے کسی پہلے ملک کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہوگا۔ دوسری بات یہ قبول کی گئی کہ آج سے عیسائیت میں کیتھولزم بھی ہوگا، لوتھرزم بھی ہوگا اور کیلونزم بھی ہوگا۔ مختلف مذاہب عیسائیت کا حصہ ہوں گے اور اس کے بعد ہم جنگ نہیں کریں گے۔ ٹریٹی آف ویسٹ فیلیا 1648ء میں ہوئی مگر اس کے باوجود جنگ کچھ عرصہ پھر بھی چلتی رہی۔ اس معاہدے کے بھی تقریباً 52 سال بعد یعنی 1700ء میں ایک امن کا ماحول قائم ہوا۔ جب امن کا ماحول قائم ہوا اور ریاستوں نے واقعی یہ قبول کر لیا کہ ہم ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں نہ تو مداخلت کریں گے اور ایک دوسرے کے مذہب کے حوالے سے رواداری کا رویہ اپنائیں گے۔ ایک دوسرے سے مذہبی بنیاد پر نہیں لڑیں گے۔

اس کے بعد یورپ کے اندر کون سا دور شروع ہوتا ہے؟ اسے کہتے ہیں روشن خیالی کا دور (Age of Enlightenment)۔ جس کے متعلق فرانسیسی تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ اس کا آغاز 1715ء میں ہوا. اور یہ 1789ء تک چلا۔ یعنی روشن خیالی کا دور تقریباً ایک صدی پر محیط ہے۔ اس دور میں بیکن، ڈیکارٹ، لاک، ہیوم، سپینوزا، ڈیڈیرو، عمانوائیل کانٹ، روسو، ایڈم اسمتھ، وولٹیئر، وہ تمام عظیم فلسفی سامنے آئے جن کی بنیاد پر یورپ آج ایک جدید یورپ بنا۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ مذہبی جنگ جو یورپ میں ہوئی اور 178 سال تک جاری رہی اس کا نتیجہ صرف اور صرف یہ ہوا کہ اس میں لاکھوں لوگوں نے ایک دوسرے کو قتل کیا۔ پورے کے پورے ان دو سو سالوں میں یورپ نے کوئی ترقی نہیں کی۔ مگر جب انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ نمبر ایک ہم ایک دوسرے کی ریاستوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے اور دوسرے نمبر پر یہ کہ مذہبی بنیاد پر جھگڑا نہیں کریں گے۔ اس کے بعد یورپ نے اصل اور حقیقی ترقی کرنا شروع کی۔ ان مذہبی جنگوں کے بعد تقریباً 2 سو سال تک یورپ کے اندر کوئی بہت بڑی جنگ نہیں ہوئی۔ جو پھر بڑی جنگ ہوئی وہ پہلی عالمی جنگ تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب یورپ نے سائنس، ادب، آرٹس اور سوشل سائنسز میں بے تحاشا ترقی کی۔ ان کا سرمایہ دارانہ نظام پھیلا۔ انہوں نے دنیا کے دیگر ممالک کو اپنی نوآبادیات بنا لیا۔ ہندوستان کو فتح کیا، مشرق وسطی کو فتح کیا، شمالی افریقہ کو فتح کیا، اور کلونیل ازم کا دور شروع ہوا۔ یورپ کی وہ چھوٹی چھوٹی طاقتیں جو آپس میں لڑ لڑ کے تباہ ہو رہی تھیں وہ عالمی طاقتیں بنیں۔ اسی بنیاد پر سیکولر لوگ بھی یہی کہتے ہیں کہ اگر ہم ایک دوسرے کے ساتھ رواداری اپنا لیں۔ اگر ریاست مذہب کی بنیاد پر کسی کے ساتھ امتیازی سلوک نہ کرے۔ اگر ریاست کا اپنا کوئی مذہب نہ ہو تو جو مختلف مذاہب کے لوگ پاکستان میں رہتے ہیں ان کا ایک دوسرے